مدّ و جزر

شفیق الرحمان

مدّ و جزر

شفیق الرحمٰن

۱۹۴۶

فہرست

شریر پھُول

بچپن کی جو جو باتیں مجُھے یاد ہیں ان سب میں نمایاں پھُول ہیں۔ ابّا نہروں کے محکمے میں تھے۔ جہاں تبادلہ ہوتا کیمپ میں گھری ہوئی کوٹھی ہوتی جس کے چاروں طرف پھُولوں سے بھرا ہوا باغ۔ جہاں درختوں سے زیادہ پھُولدار پودے ہوتے۔ سب سے پہلے دو چیزیں دیکھیں۔ امّی کا پُر شفقت چہرہ اور رنگ برنگے پھُول۔ گلدانوں میں سجے ہوئے پھُول، ننھی کے بالوں میں لگے ہوئے پھُول، انا کے گلے میں پڑے ہوئے پھُولوں کے ہار، حوض میں تیرتے خوشبودار پھُول، ابّا کی میز پر رکھے ہوئے پھُولوں کے گچھے۔ گھر میں چاروں طرف پھُول ہی پھُول ہوتے۔ صحن تو پھُولوں سے بھرا رہتا اور انا مجُھے پھُولوں کے متعلق کہانیاں سنایا کرتی۔ اس نے بتایا کہ پھُول بے جان نہیں ہوتے۔ یہ ہماری طرح سانس لیتے ہیں، ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، بعض اوقات غمگین بھی ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ شریر گلاب کے پھُول ہیں جن کا کام ہر وقت مسرور رہنا ہے۔ یہ دوسروں پر ہنستے رہتے ہیں۔ کسی کو اداس دیکھا اور قہقہے لگانے لگے۔ گل

اشرفی وہاں ہوتا ہے جہاں زمین میں سونا ہی سونا ہو۔ رات کی رانی کے پھُولوں کی کبھی سورج سے لڑائی ہو گئی تھی، چنانچہ اسی ضد میں وہ بھی دن میں نہیں کھلتے ہمیشہ رات کو کھِلتے ہیں۔ سورج مکھی کا پھُول البتہ سورج پر عاشق ہے لیکن سنا ہے کہ سورج اس کی ذرا پروا نہیں کرتا۔ سورج پھُولوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ ویسے وہ کسی نہ کسی پر عاشق ضرور ہے، تبھی تو ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ لیکن سورج مکھی کو خواہ مخواہ غلط فہمی ہے۔ چنبیلی کے پھُول بے حد غمگین رہتے ہیں، لیکن ان کی اداسی کی وجہ کسی کو معلوم نہیں۔ جب ہوا کے جھونکے چلتے ہیں تو یہ دبی دبی آہیں بھرتے ہیں۔

نرگس کے پھُول ہمیشہ کسی کے منتظر رہتے ہیں۔ کوئی ان سے ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا اور ابھی تک نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن رات منتظر رہتے ہیں۔ جہاں شبّو کی کلیاں ہوں وہاں رات کو پریاں اُترتی ہیں اور رات بھر کھیلتی رہتی ہیں۔ کلیوں کو گُدگُداتی ہیں۔ اگر اتّفاق سے کوئی ہنس دے تو وہ کھِل کر پھُول بن جاتی ہیں۔ آسمان سے پریاں کسی کسی جگہ اُترتی ہیں۔ یہی وجہ ہے شبّو کی کلیاں ہر جگہ نہیں ملتی۔ اور شبّو کے پھُول تو قسمت سے ہی نظر آتے ہیں۔ صبح کے وقت جو ہوا چلتی ہے وہ موتیے کی کلیوں کا منہ چومتی ہے اور کلیاں چٹک چٹک کر پھُول بن جاتی ہیں۔ جو نکھار اور روپ صبح صبح موتیے کے پھُولوں پر ہوتا ہے، چمن کے کسی پھُول پر نہیں ہوتا۔ چھوئی موئی کی کلیاں بے حد شرمیلی ہیں ہر وقت محجوب

رہتی ہیں۔ کوئی انہیں دیکھے یا نہ دیکھے۔ چھیڑے یا نہ چھیڑے یہ بغیر کسی وجہ کے شرماتی رہتی ہیں۔ انا ایسی بہت سی باتیں سنایا کرتی اور میں بڑے شوق سے سُنتا۔ بچپن میں اگر کسی کو پھُول مسلتے دیکھتا تو جی چاہتا کہ اس کا مُنہ نوچ لوں۔ ہر روز انا سے لڑتا۔ وہ صبح صبح اتنے پھُول توڑتی کہ سارا باغ خالی ہو جاتا۔ جب سکول سے فرصت ملتی سیدھا باغ میں جا پہنچا۔ مالی بہتیرا منع کرتا لیکن میں خود پھُولوں کو سینچتا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مالی ایک بڑی سی قینچی لیے پودوں کو تراش رہا ہے۔ رات کو میں چپکے سے اس کے گودام میں گیا۔ قینچی چُرالی اور سامنے بہتی ہوئی ندّی میں پھینک آیا۔

میں ان دنوں پھُولوں کو بے حد معصوم سمجھتا تھا، بالکل بھولے بھالے جنہیں کُچھ بھی تو پتہ نہیں۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ پھُول سیدھے سادے ہرگز نہیں ہوتے۔ وہ انتہا سے زیادہ شریر ہوتے ہیں۔ شرارتوں کے سوا انہیں اور کوئی کام ہی نہیں۔ جب دیکھو کُچھ نہ کُچھ کرتے رہتے ہیں۔

وہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دونوں کوٹھیاں ایک ہی احاطے میں تھیں اور دونوں کا ایک ہی باغ تھا۔ ہم دونوں کے کمرے بالکل آمنے سامنے تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ ایک رات میری آنکھ کھلی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باغ کے پتّے پتّے پر چاندنی ناچ رہی تھی۔ فضا میں خوشبوؤں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ہوا کے ہلکے

ہلکے جھونکے اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ یہ ایک ایسی دلفریب رات تھی جیسی خوابوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ میری نگاہیں سامنے جم کر رہ گئیں۔ دونوں کمرے کے دریچے آمنے سامنے تھے۔ وہ سفید لباس پہنے خوابیدہ تھیں۔ تکیے پر ان کی لمبی لمبی زلفیں پریشان تھیں۔ ان کے چہرے پر چاند کی کرنیں رقصاں تھیں۔ جیسے کسی سنگ تراش کا شاہکار ہو یا کسی مصوّر کی لاثانی تصویر۔ حُسن جب خوابیدہ ہو تو اس کی دلکشی کس قدر بڑھ جاتی ہے۔

میں نے ایک سفید گلاب کے پھُول کو دیکھا جو کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ ایک لمبی سی ٹہنی پر وہ پھُول تنہا تھا اور اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا ہو۔ یہ پھُول کھڑکی میں کہاں سے آ گیا؟ عین نیچے گلاب کا پودا تھا اور یہ پھُول غالباً ابھی کھلا تھا۔ ہوا کا جھونکا آیا اور پھُول آگے بڑھا۔ ان کے چہرے کی طرف، بالکل نزدیک پہنچ کر واپس آ گیا۔ ایک اور جھونکا آیا اور پھُول جھوم کر ان کے ہونٹوں کے قریب پہنچ گیا جیسے انہیں چومنا چاہتا ہو۔ میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کیا واقعی ہوا چل رہی ہے یا یہ پھُول شرارت کر رہا ہے؟ میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر دیکھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ پھُول پھر جھُکا۔ اس مرتبہ اس نے ہونٹوں کو بس چھو ہی لیا لیکن فوراً واپس آ گیا۔ میں نے سر باہر نکال کر چاند کو دیکھا جو بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ آسمان پر نہ دُھند تھی نہ کوئی بدلی۔ پھُول جھُوما آگے جھکتا گیا، جھکتا گیا، حتیٰ کہ اس نے وہ ہونٹ چوم لیے۔

کل صبح اسے ضرور توڑوں گا۔ چاندنی یکلخت پھیکی پڑ گئی۔ چاند نے اپنا چہرہ ایک ننھی سی بدلی کے پیچھے چھپالیا تھا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ ذرا ذرا دیر کے بعد پھُول جھومتا اور ان کے ہونٹ چوم لیتا۔ جب چاند درختوں کے پیچھے چلا گیا، ستارے ٹمٹمانے لگے اور آسمان پر ہلکی ہلکی سفید روشنی پھیلنے لگی تو ایک ننھی سی چڑیا کہیں سے اُڑ کر آ گئی۔ دریچے میں اس کے رنگین پر بہت پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے نہایت دلکش سُروں میں ایک نغمہ چھیڑا اور اپنے چہچہوں سے انہیں جگا دیا۔ جب انہوں نے مُسکرا کر کروٹ لی تو پھُول پیچھے ہٹ گیا۔

صبح کے وقت دیکھا تو کھڑکی کے سامنے ایک سُرخ گلاب کا پھُول مُسکرا رہا تھا۔ لیکن رات تو یہ سفید تھا۔ یہ سُرخی اس نے کہاں سے چُرا لی؟ ان کے ہونٹوں سے؟ یا یہ شرما شرما کر سُرخ ہو گیا۔

وہ بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ چاروں طرف پھُولوں کے تختے تھے۔ انہوں نے نہایت خوشنما لباس پہن رکھا تھا۔ ایسا رنگین لباس جسے دیکھ کر پھُول بھی آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ان رنگوں میں وہ اتنی حسین معلوم ہو رہی تھیں کہ پھُولوں کی طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر دفعہ بیڈمنٹن کی چڑیا کو اتنے زور سے مارتیں کہ وہ پھُولوں میں جا گرتی اور ان کی مخالف دوڑ کر اُٹھا لاتی۔

چاروں طرف پھُول گم سم کھڑے تھے۔ اتنے میں اُن کی مخالف نے اُن کی طرف زور سے شاٹ مارا جسے وہ کھیل نہ سکیں۔ چڑیا پھُولوں میں جا گری۔ وہ اُٹھانے کو لپکیں اور پھُولوں میں ہلچل مچ گئی۔ چڑیا گیندے کے پھُولوں میں گری تھی۔ وہ کُچھ اس انداز سے جھولے کہ چڑیا اچھل کر نرگس کے پھُولوں میں جا الجھی۔ انہوں نے شرارتاً اسے اچھال دیا۔ گلاب کے پھُولوں میں الجھا دی۔ انہوں نے پہلے تو ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ اسے پکڑ لیں لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور چلی گئی تھی۔ جب وہ آہستہ آہستہ پودوں سے کتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں تو پھُول اُچھل اُچھل کر ان کے دامن کو چومنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند کانٹوں نے ان کے دوپٹے کو تھام لیا۔ انہوں نے لمبی لمبی سفید انگلیوں سے ٹہنیوں کو ہٹایا اور جونہی چڑیا کو پکڑنے لگیں ایک پھُول نے کانٹے کو آنکھ مار دی۔ کانٹا اُن کی انگلی میں چبھ گیا۔ اف کر کے وہ پیچھے ہٹیں اور گلاب کے پھُول مُسکرا مُسکرا کر جھومنے لگے۔ پھر وہ سارے لہک اُٹھے۔ اور وہی پھُول جو ابھی گم سم کھڑے تھے، جھوم جھوم کر قہقہے لگانے لگے۔

باغ میں ایک بادام کا درخت بھی تھا۔ اس میں شگوفے پھوٹے۔ سوکھی سوکھی ٹہنیوں پر گلابی کلیوں نے وہ سماں باندھا کہ سارے باغ میں یہ درخت نمایاں ہو گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ کتاب ہاتھ میں لیے باہر نکلیں۔ شاید باغ میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اسی حسین درخت کو منتخب کیا۔ اس کے

سائے میں بیٹھ گئیں۔ ابھی ایک دو صفحے ہی پڑھے ہوں گے کہ ایک کلی ٹہنی سے ٹوٹی، پتّوں سے الجھتی ہوئی ان کی گود میں آ گری۔ انہوں نے اسے اٹھالیا سونگھا اور کتاب میں رکھ لیا۔ فوراً ہی دوسری کلی آ گری۔ انہوں نے اسے اٹھا لیا پھر تیسری، غرضیکہ کلیاں اسی اُمّید میں گرنے لگیں کہ شاید وہ انہیں اٹھا اٹھا کر اپنی گود میں رکھی جائیں گی۔ انہوں نے اوپر دیکھا۔ چہرے پر مسکراہٹ اور غصّہ ملے جلے سے تھے۔ اتنے میں تیزی سے ایک کلی سیدھی ان کے لبوں پر آ گری۔ لب چوم کر گود میں گر گئی۔ پھر جو کلیوں کی بارش شروع ہوئی ہے تو وہ پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے دوپٹے سے سر کو اچھی طرح ڈھانپ لیا، کتاب سے سر پر سایہ کر لیا لیکن کلیاں بے تحاشا گرتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ کلیوں کی بارش ختم ہو چکی تھی اور درخت خاموش کھڑا تھا۔

میں باغ میں ان کا انتظار کر رہا تھا اور یقین ہی نہ آیا تھا کہ وہ آئیں گی۔ میں نے بچّوں کی طرح ضد کی تھی۔ جب انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تو میں نے فرمائشوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آپ ضرور وہ چمکیلے تاروں جیسے آویزے پہن کر آئیں گی۔ میری محبوب خوشبو لگا کر، میرا پسندیدہ گلابی ملبوس پہن کر، لٹوں کو دونوں شانوں پر پریشان کر کے۔، اسی طرح کی عجیب و غریب فرمائشیں کی تھیں اور ضد بھی

کی تھی۔ وہ کہنے لگیں کہ اگر گلابی لباس رات کو پہنا تو امّی باز پُرس کریں گی لیکن میں مچل گیا۔

میں پھُولوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ بار بار گھڑی کو دیکھتا، پھر چاند کو، چاند درختوں کی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا جا رہا تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ اب ایک گھنٹے تک چاند غروب ہو جائے گا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ چاندنی میں آؤں گی، دیر ہر گز نہ ہو سکی۔ اور اب چاند غروب ہوا چاہتا ہے۔ اگر اندھیرا ہو گیا تو ان کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکوں گا۔ بالکل میرے قریب ایک غنچہ چپ چاپ ٹہنی پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے بے صبر ہو کر اس سے پوچھا۔ کیا وہ آئیں گی؟ غنچے نے جیسے آہستہ سے جنبش کی۔ میں نے پھر سرگوشیوں میں پوچھا، کیا وہ سچ مچ آئیں گی؟ غنچہ لہرایا۔ اور یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو کہ آئیں گی۔ لیکن کب آئیں گی؟

چاند کُچھ دیر میں غروب ہو جائے گا۔ میں آج چاندنی میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ غنچے سے پھر پوچھا۔ یوں نہیں، اس جنبش سے کام نہیں چلے گا صاف صاف بتا، پھر سوچا کیا بے وقوفوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ غنچے کبھی بولے ہیں۔ واقعی میں پاگل ہوں۔ تبھی تو اتنی رات گئے یہاں منتظر بیٹھا ہوں۔ پھر انتظار بھی ان کا کر رہا ہوں جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چاند بھی رات بھر منتظر رہتا ہے۔ دریچوں سے، کھڑکیوں سے، ٹہنیوں سے، جہاں سے اسے موقع ملے

گھورتا رہتا ہے۔ مُجھے حُسن سے عنایات کی توقع ہے! بھلا حُسن اگر مہربان ہو جائے تو وہ حُسن کیسا؟ حُسن اور غرور ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ انہیں کیا ضرورت ہے جو ایسے وقت چل کر مُجھے ملنے آئیں اور مجھ میں ہے ہی کیا؟ لیکن انہوں نے جو وعدہ کیا تھا۔ افوہ! بارہ بجنے والے ہیں اور چاند درختوں کے جھنڈ میں جارہاہے۔ اب اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے گا۔ یہ کیسی آہٹ ہے؟ یہ کون آیا۔ میرا دِل دھڑکنے لگا۔ نہیں! کوئی نہیں! ہوا کا جھونکا تھا۔ اب وہ نہیں آئیں گی۔۔ ہرگز نہیں آئیں گی۔۔ اور وہ غنچہ کہاں گیا؟ جو دیکھتا ہوں تو سامنے غنچے کی جگہ ایک پھُول مُسکرارہاہے۔ مگر یہ غنچہ کہاں ہے؟ میں نے اسے تلاش کیا لیکن وہ نہ ملا۔ کہیں وہ کھل کر پھُول تو نہیں بن گیا؟ یہی ٹہنی تو تھی۔ یہ وہی ہے۔ ابھی کھلا ہے۔ کِھل کر اس نے اشارہ تو کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ضرور آئیں گی۔ میں نے پھُول سے کہا۔۔ دیکھو اگر واقعی وہ آ گئیں تو تجھے ان کے بالوں میں لگاؤں گا۔ پھُول نے اپنی پنکھڑیاں پھیلا دیں اب وہ ایک مکمل اور شگفتہ پھُول بن چکا تھا۔ چپکے سے چاند درختوں کے پیچھے چلا گیا اور تاریکی پھیل گئی۔

آس پاس پھیلے ہوئے درخت نہایت مہیب دکھائی دینے لگے۔ چاروں طرف ایک وحشت سی برسنے لگی۔

"چاند غروب ہو چکا۔" میں نے شکوہ کیا۔

انہوں نے مجُھے مُسکرا کر دیکھا۔ اور چاروں طرف اجالا ہی اجالا تھا۔ ستارے بڑی تیزی سے چمکنے لگے۔ ایک عجیب سی روشنی کہیں سے آئی اور فضا میں پھیل گئی۔ ان کی آنکھیں کسی ملکوتی نور سے روشن تھیں۔ ان کے آویزوں میں دو ستارے چمک رہے تھے۔ انکے دوپٹے کا سنہرا پلّو۔ اور پھر ان کا دمکتا ہوا چہرہ اتنی روشنی تھی کہ میں چاند اور اس کی چاندنی کو بھول گیا۔

جب میں نے ان رسیلے سُرخ ہونٹوں کو نزدیک سے دیکھا تب محسوس ہوا کہ اس رات اس شریر پھُول نے انہیں چوم کر بڑی گستاخی کی تھی۔

اپنے سامنے کھلے ہوئے پھُول کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اسے توڑ کر ان کے بالوں میں سجادوں لیکن پھُول پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے پھر ہاتھ بڑھایا۔ وہ پھر جھوم کر پرے چلا گیا۔ یہ شریر ہوا کے جھونکوں کے بغیر کیونکر جھوم رہا ہے؟ اس مرتبہ میں اسے ضرور توڑوں گا۔ پھر آگے جھُک کر ہاتھ بڑھایا تو وہ پتّوں میں جا چھُپا۔

”کیا تلاش کر رہے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ابھی ابھی یہاں ایک پھُول تھا جسے میں نے آپ کی زلفوں کے لیے چُنا تھا۔“

اور جب انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے یہ پھُول کہاں سے تڑپ کر نکلا، سامنے آیا اور ان کی انگلیوں سے خود بخود چھو گیا۔ ذرا سی دیر میں وہی پھُول ان کی

زلفوں میں آویزاں تھا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرا رہا تھا۔
شریر کہیں کا۔

احمق

دیکھنے میں وہ احمق بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات تو بڑا سمجھدار اور ذہین لگتا۔ لوگ اسے اچھا لڑکا سمجھتے تھے۔ ویسے بھی وہ برا نہیں تھا۔ تعلیم میں ہوشیار تھا۔ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا۔ کھیلوں میں مہارت تھی۔ اس کی گفتگو ہمیشہ دلچسپ ہوتی۔ شکل و صورت میں بھی اچھا خاصا تھا لیکن پھر بھی کُچھ کُچھ احمق ضرور تھا اور اس کا علم یا تو اس کے قریبی واقفوں کو ہوسکتا یا ان کو جو بڑے غور سے اس کی حرکات کا مطالعہ کرتے رہے ہوں۔

وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی بیشتر حرکتیں احمقانہ ہوتی ہیں لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کُچھ عادت سی ہوگئی تھی۔ مثلاً وہ ہمیشہ لمبے سے لمبے راستے سے کالج جایا کرتا جو اصل راستے سے کافی طویل ہوتا اور اسے اس میں بڑا لطف آتا۔ اتوار کو جب وہ اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر نکلتا تو پیچھے اس طرح بیٹھتا کہ اس کا مُنہ دوسری طرف ہوتا۔ راستے میں جو دیکھتا وہی مُسکرا دیتا۔ سینما جاتا تو ہمیشہ سیکنڈ شو میں اور بالکل اکیلا اور عموماً اسی پکچر میں جاتا جہاں بہت ہی کم لوگ

ہوتے۔ بعض اوقات بارش میں اچھا سا سوٹ پہن کر بغیر چھتری کے سیر کو نکل جاتا اور اچھی طرح بھیگ کر بڑے مزے سے چہل قدمی کرتا ہوا واپس لوٹتا۔ ویسے وہ اپنے کالج میں کافی ہر دلعزیز تھا۔ چند ایک لڑکیاں بھی اسے پسند کرتی تھیں۔ ایک کو تو یہ بہت ہی عزیز تھا۔ اس کا دِل بالکل صاف تھا، آئینے کی طرح۔ اس نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی اور نہ کبھی برائی سوچی۔ یہاں تک کہ جب کوئی اس کے بارے میں بُرا بھلا کہتا تو وہ معاف کر دیتا۔ وہ فوراً دوسروں پر یقین کر لیتا۔ اسی لیے اکثر لوگ اسے دھوکہ دے جاتے۔ اور جب کوئی دوست اسے دھوکہ دیتا تو اسے بہت ہی افسوس ہوتا اور اس کا دِل گھُٹنے لگتا۔

ایک روز اسے اتفاق سے ایک خط مل گیا جو ایک خاتون نے کسی کو لکھا تھا۔ اس خط میں اس کی حماقتوں کا ذکر تھا اور اسے بے وقوف کہا گیا تھا۔ یہ خط نہایت ہی تلخ تھا۔ اسے بڑا افسوس ہوا۔ کئی مرتبہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آئے۔ اتفاق سے انہی دِنوں اسے ایک اور لڑکی کا خط مِلا جو اسے بہت اچھا سمجھتی تھی اور جس کی وہ کُچھ زیادہ پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ خط میں اس کی بے حد تعریفیں کی گئی تھیں۔ اسے وجیہہ، جاذبِ نظر، ہنس مکھ، عقلمند اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا۔ وہ کتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ ان دونوں خطوں میں سے کون سا صحیح ہے اور کون سا غلط۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہی خط صحیح ہے جس میں اسے بے وقوف لکھا گیا ہے۔

پھر ایک دن اس نے ناہید کو دیکھ لیا اور اس کی دنیا بدل گئی۔ طرح طرح کی مسرتیں اس کی زندگی میں آئیں۔ وہ ہر وقت مسرور رہنے لگا۔ پہلے اس کے خیالات منتشر سے رہتے تھے لیکن اب وہ محض ناہید کے متعلق ہی سوچتا رہتا۔ پہلے اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا اور اب ناہید ہی اس کی آرزو تھی۔ وہ ہی اس کی جستجو تھی۔

جب اس نے ناہید کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یوں محسوس کیا جیسے کسی پرانے چھوڑے ہوئے رفیق کو ڈھونڈ لیا ہو۔ اس کے بعد عجیب سے حادثے شروع ہو گئے۔ تقریباً ہر ہفتے ناہید کہیں نہ کہیں اسے دکھائی دے جاتی اور یہ اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہتا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے ناہید کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے دوست سے ملنے کئی میل دور گیا وہاں دفعتاً اسے معلوم ہوا کہ ناہید اس کے پڑوس میں رہتی ہے۔ مکان کی چھت سے اس کی نگاہ دوسری کوٹھی کے باغ میں چلی گئی جہاں ناہید بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اس روز اس نے جی بھر کر ناہید کو دیکھا۔

وہ نہایت ہی پیاری گڑیا سی لگ رہی تھی۔ پھر اسے پتہ چل گیا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ اس کے گال بالکل سُرخ ہو گئے اور جب اس نے اوپر دیکھا اور نظریں چار ہو گئیں تو یہ ایسا بے اوسان ہوا کہ بری طرح وہاں سے بھاگا۔

پھر ایک اور اتفاق ہوا۔ اتوار کو اپنے عزیزوں سے ملنے گیا۔ وہاں کوئی خاتون اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی تھیں، یہ انہیں چھوڑنے گیا اور وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ یہ تو ناہید کا گھر ہے۔ اس کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر اکیلا بیٹھا تھا تو اسے عجیب سا احساس ہوا جیسے ناہید اسے دیکھ رہی ہے۔ ویسے ایک کواڑ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور شاید وہاں کوئی کھڑا بھی تھا۔ اور اس خیال سے اس کا دِل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

چلتے وقت وہ ایک رسالہ وہیں چھوڑ آیا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ ہفتہ اسے گزارنا مشکل ہو گیا۔ دن رات صبح شام چوبیس گھنٹے اسے ناہید کا خبط رہتا۔ ہر روز وہ اپنے دوست سے ملنے اتنی دور جاتا۔ کسی بہانے چھت پر تو پہنچ جاتا لیکن نیچے دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

پھر اتوار آیا وہ اپنے عزیزوں کے ہاں گیا اور انہی خاتون کے ساتھ دوبارہ ناہید کے گھر گیا۔ وہ اندر چلی گئیں اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا، اور جب ورق گردانی کر رہا تھا تو دیکھا کہ اس میں ایک تصویر رکھی ہے۔۔ ناہید کی تصویر۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا کہ کتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا اور کیا کیا سوچتا رہا۔

جب وہ واپس آ رہا تھا تو جیسے بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا۔ اس قدر مسرور شاید وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ سارا دن تصویر کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ اسے ایک ایک

خدوخال زبانی یاد ہو گیا۔ اس نے سوچا اب ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ محبّت کی زندگی جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور وہ نہایت ہی خوش نصیب ہے۔

اب وہ دن بدن ہنس مکھ اور اچھا لڑکا بنتا جا رہا تھا لیکن اس کی حماقتیں بدستور تھیں، بلکہ پہلے سے کُچھ زیادہ ہی ہو گئی تھیں۔ اکثر وہ ایسے راستوں پر ناہید کا انتظار کرتا جہاں اس کا گُزر تقریباً ناممکن ہوتا۔ وہ دریا پر جا کر کشتی چلاتا رہتا اور اسے ناہید کا انتظار رہتا۔ وہ اس پر دِل ہی دِل میں ہنستا بھی کہ بھلا اتنی دور ناہید کیوں کر آئے گی؟ پھر سوچتا کہ شاید اتفاق سے وہ ادھر سے گزرتی ہوئی کبھی آ جائے۔ حادثے بھی تو ہوتے رہتے ہیں۔ اسے کسی خوشگوار حادثے کی اُمّید تھی۔

ایک اور عجیب سا خبط اسے ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا کہ ناہید اسے خط لکھے گی۔ کسی نہ کسی روز ایک ہلکا پھلکا، نیا سا معطّر لفافہ آئے گا جس میں محبّت بھرا خط ہو گا۔ چنانچہ ہر وقت اسے ناہید کے خط کا انتظار رہنے لگا۔ جو خط اس کے نام آتا اسے ناہید کا خط دکھائی دیتا۔

ہر وقت وہ ناہید کے خواب دیکھا کرتا۔ رات کو بھی، دن کو بھی۔ اور جو چند لڑکیاں اسے پسند کرتی تھیں ان سے بے رُخی برتنے لگا کیونکہ اب ناہید ہی اس

کے لیے سب کُچھ تھی۔ اس کا دِل، اس کے خیالات، اس کی روح__ سب ناہید کے تھے۔

لیکن ایک لڑکی صوفیہ تھی کہ مانتی ہی نہ تھی۔ دونوں پرانے واقف تھے۔ بھلا اتنی پرانی اور پُر خلواص دوستی صوفیہ کیوں کر ختم کر دیتی۔ آخر تنگ آکر اس نے صوفیہ کو ناہید کے متعلق سب کُچھ بتا دیا۔ صوفیہ پھر بھی نہ مانی اور بولی:

"یہ میں جانتی ہوں کہ مُجھے آپ کی محبّت نہیں مل سکتی مگر اتنی دیرینہ رفاقت کو یکلخت کیسے چھوڑ دوں۔"

لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے سوچا کہ اب کسی اور لڑکی سے ملنا ایک قسم کی خیانت ہے۔ اپنے اس رویے پر اسے افسوس ضرور تھا لیکن اس وقت ناہید اسے دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی۔ آخر اس نے صوفیہ سے کہہ دیا کہ آئندہ کبھی نہیں ملیں گے اور وہ بھولی بھالی لڑکی چپ چاپ چلی گئی اور پھر نہ آئی۔

عید سے ایک روز پہلے وہ اپنے اسی دوست کے ہاں مدعو تھا۔ جب شام ہوئی تو کسی بہانے چھت پر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے باغ میں ناہید بیٹھی چاند دیکھ رہی تھی۔ جب اسے چاند نظر آیا تو اس نے فوراً ناہید کا چہرہ دیکھا۔ اس کے خیال میں یہ نیک شگون تھا۔ ناہید ہاتھ اٹھائے دُعا مانگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی آسمان

کی جانب اٹھ گئے اور اس نے بڑے خلوص سے دُعا مانگی کہ ”خدایا ہم دونوں علیحدہ علیحدہ جا رہے ہیں، ہمارے راستے بھی دور دور ہیں۔ ہماری ایک ہی منزل ہو جائے۔ ہم اکٹھے یہ سفر طے کریں۔ ایک دوسرے کے رفیق بن جائیں۔ اس وقت ہم دونوں کی نگاہیں عید کے چاند پر ہیں۔ آئندہ عید کا چاند ہم اکٹھے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دیکھیں وہ خوشگوار حادثے شروع ہو جائیں جن کا مُجھے اتنی دیر سے انتظار ہے اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں۔“

اس نے ناہید کو دیکھا۔ وہ بھی دُعا مانگ رہی تھی۔ شاید وہ بھی یہی دُعا مانگ رہی ہو کیونکہ جب ناہید کے لیے وہ اتنے دنوں سے بے چین ہے، اتنی دعائیں مانگی ہیں اپنی نگاہوں سے سب کُچھ کہہ ڈالا ہے، تو بھلا اسے اس کا خیال کیوں نہ ہو گا۔ ضرور وہ بھی یہی دُعا مانگ رہی ہے۔

اس اُمّید نے ایک عجیب سا سرور طاری کر دیا۔ جب وہ نیچے اُترا تو دِل میں بے شمار امنگیں تھیں، امیدیں تھیں، آرزوئیں تھیں اور خیالات میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آج کی دُعا ضرور قبول ہو گی۔

اگلے روز عید تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا وہ نہایت ہی اداس رہا، بے حد غمگین۔ اس نے اپنا کمرہ بند کر لیا اور دن بھر اندر بیٹھا رہا حالانکہ دوستوں کے ساتھ اس نے کئی پروگرام بنائے ہوئے تھے، لیکن وہ کہیں نہ گیا۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس

کے آنکھوں کے سامنے ناہید کی موہنی مورت تھی۔ آج اس نے رنگین لباس پہنا ہو گا۔ چمکیلا اور نہایت خوش نما لباس۔ اس کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ ہو گی۔ جگمگاہٹ ہو گی۔ انوکھا روپ ہو گا۔ یہ ایک پیاری سی گڑیا دکھائی دے رہی ہو گی۔ ان بڑی بڑی آنکھوں میں نرالا سحر ہو گا۔

پھر جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جانا پہچانا مکان آ گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ اس کا گھر ہے اور وہ تھکا ہارا واپس لوٹ رہا ہے۔ سامنے سنگِ مرمر کے ستونوں میں ناہید کھڑی ہے۔ اسی لباس میں اور اسی روپ میں جو اس کے تخیّل میں بس رہا تھا۔

وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ مُسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ بے حد مسرور تھا۔

اور جب وہ اپنے خوابوں سے چونکا تو شام ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ کسی دوست سے مل آئے۔ پھر سوچا کہ آج میں بہت اداس ہوں اور اداسی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے وہ کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ اس کے دِل میں ناہید کی محبّت جڑ پکڑتی گئی اور وہ بدستور خوشگوار حادثوں کا منتظر رہا۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ وہ کئی مہینوں تک ناہید کو

نہ دیکھ سکا۔ ایک روز اس کے دِل نے بغاوت بھی کی۔ وہ ایک شام دریا میں کشتی چلا رہا تھا۔ کشتی کو کنارے لگا کر ریت پر بیٹھا غروبِ آفتاب دیکھنے لگا۔ تب ایک عجیب سی اداسی دِل میں اُتر گئی۔ اس کی روح کو جیسے تاریکی نے ڈھانپ لیا اور طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اتنے میں چاند نکل آیا۔ چودھویں کا چاند۔ وہ چاند کو تکنے لگا۔ ناہید کو دیکھے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں اس نے پوری پوری کوشش کی تھی کہ کہیں اس کی ایک جھلک ہی نظر آ جائے اور جو وہ اب کبھی نظر نہ آئے پھر؟۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کوئی ضروری تو نہیں کہ اس کے پریشان خوابوں کی تعبیر اچھی ہی نکلے۔ اور یہ محبّت بھی کیسی بے معنی سی تھی۔ نہ کبھی ناہید سے بات کی تھی نہ کُچھ۔ بس وہ خود ہی اس آگ میں جلتا رہا تھا۔ کیسی عجیب محبّت تھی۔ اگر کوئی سُنے تو ہنس پڑے۔ بہت دیر تک یونہی بیٹھا سوچتا رہا۔ دریا کی شفاف سطح پر چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ زرد رنگ کا بڑا سا عکس ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اب یہ کتنا بڑا ہے۔ کل سے گھٹنا شروع ہو گا پھر ایک دن غائب ہو جائے گا۔ بعد میں باریک سا طلوع ہو گا۔ اسی طرح یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔ یہ سب کُچھ مقرر ہے، لیکن یہ سب کُچھ کس قدر بے معنی ہے۔ چاند اور اس کا عکس دونوں بے معنی ہیں اور جو کچھ میں سوچتا ہوں وہ کس قدر بے معنی ہے۔

یہی چاند تب بھی چمک رہا تھا۔ جب میں نے ناہید کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ بالکل ایسا ہی گول اور بڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے کیسی کیسی دعائیں مانگیں کیسے کیسے جتن کیے لیکن اب ناہید مجھ سے اتنی ہی دور ہے جتنے یہ چاند ستارے۔ اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور لہروں سے کھیلنے لگا۔ اس نے سوچا کہ یہ دریا ہمیشہ چپ چاپ بہتا رہتا ہے۔ اب یہ سمندر میں جا گرے گا۔ پھر وہی پانی بادل بن کر آسمان سے برسے گا اور شاید اسی دریا میں بہنے لگے گا۔ یہ ستارے رات بھر کیوں ٹمٹماتے رہتے ہیں اور ہر رات کتنے ٹوٹتے ہیں پھر بھی اتنے کے اتنے ہیں۔ یہ دن رات اور صبح و شام اس قدر پھیکے بے رنگ و بو کیوں ہیں؟ قدرت اس قدر لاپروا کیوں ہے؟ جہاں بے شمار پھُول کھلتے ہیں وہیں لاتعداد کلیاں مُرجھاتی ہیں۔ جو اُمّید قدرت دِل میں تخلیق کرتی ہے اسی کو خود نابود کیوں کر دیتی ہے؟ کیا یہ خلوص اور دعائیں سب بیکار ہیں اور محبّت کیسی فضول چیز ہے؟ اس میں ہم ہمیشہ وہ کُچھ سوچتے ہیں جو ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہمیشہ غیر ممکن باتوں کے متعلق سوچتے ہیں۔ جو نہ ہو سکتی ہیں اور نہ ہوں گی۔ اور محبّت میں انسان کس قدر بے وقوف بن جاتا ہے؟ اسے سب کُچھ رنگین نظر آنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہاں ہر ایک کی راہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ ہر ایک کا تنہا راستہ ہے جسے بالکل اکیلے طے کرنا ہے۔ زندگی کے سفر میں کوئی کسی کا رفیق نہیں۔

تب اسے سب کُچھ بے معنی دکھائی دینے لگا۔ یہ چاند تارے، زمین و آسمان سے بہتا ہوا دریا، سب کُچھ۔ یہ کیسی دنیا ہے؟ یہ کیسی خدائی ہے؟ اور میں ہمیشہ دیوانہ سا کیوں رہتا ہوں؟ کھویا کھویا سا کیوں رہتا ہوں؟ مُجھے اس قدر خواب کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ رات کو بھی اور دن کو بھی۔

وہ کشتی میں بیٹھ گیا اور اسے پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ تب اس نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی ناہید کے متعلق نہیں سوچے گا۔ وہ شاید اسے جانتی بھی نہ ہو۔ ناہید کے لیے وہ بالکل اجنبی ہو۔ اور دِل کا کیا ہے جس طرح چاہا بہلا لیا۔

کئی دنوں تک وہ یہی کوشش کرتا رہا کہ ناہید کے متعلق نہ سوچے۔ وہ اس میں کامیاب تو ہوا لیکن غمگین سا ہو گیا۔ دوستوں سے کترانے لگا۔ اکثر تنہا گوشوں میں افسردہ بیٹھا رہتا۔

ایک شام کو یہ پکچر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہیں دائیں طرف چلی گئیں۔ سامنے بجلی سی کوند گئی۔ سانس جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ ادھر ناہید بیٹھی تھی۔ اپنی امّی اور بہنوں کے ساتھ اور بے خبری میں سگریٹ اس کی انگلیوں سے گر گیا۔

کُچھ دیر میں وہ سنبھل گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ناہید اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نشیلی آنکھوں کا فسوں، گلاب کی پنکھڑی جیسے

لبوں کی معصوم سی مسکراہٹ، گالوں کے دو ننھے سے گڑھے، اس بھولے بھالے چہرے سے جیسے شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں واپس آ گئیں۔ دِل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بار بار وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتا۔ ذرا سی دیر میں اس نے پھر ناہید کو دیکھا جو اسکی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کوئی اس قدر حسین و جمیل بھی ہو سکتا ہے جتنی ناہید ہے؟ اس نے بے شمار خوبصورت چہرے دیکھے تھے، لیکن اس چہرے میں کُچھ ایسی جاذبیت تھی جو اس نے آج تک نہیں دیکھی اور جسے وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ ایک عجیب سا خیال اس کے دِل میں آیا۔ شاید کسی روز وہ اور ناہید پکچر دیکھنے آ جائیں۔ اسی جگہ یہیں اکٹھے بیٹھے دیکھ رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس روز وہ اپنا سیاہ سوٹ پہن کر آئے گا سیاہ بو لگا کر۔ ناہید کے ساتھ بیٹھنے میں عجیب شان ہو گی۔ تب ناہید بھی چمکیلا سیاہ لباس پہن کر آئے گی جس میں اس کا گلابی چہرہ یوں جگمگ جگمگ کرے گا کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ دفعتاً اسے ایک اور خیال آیا کہ میں کیسی احمقانہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ بھلا یہ بھی ہو سکتا ہے کبھی؟ ہے نا حماقت سراسر؟ لیکن ایسی باتیں اس کے لیے نئی تھیں۔ چنانچہ وہ بدستور سوچتا رہا اور دِل ہی دِل میں وہ باتیں دوہراتا رہا جو کہ اس روز ناہید سے کرے گا۔

جب پکچر ختم ہوئی جیسے اس کا خواب ختم ہو گیا۔

آہستہ آہستہ ہال خالی ہو رہا تھا لیکن وہ بدستور کھڑا رہا۔ جب وہ جا رہی تھی تو ناہید کا رومال گر گیا اور اس نے لپک کر اٹھا لیا۔ سوچا کہ دوڑ کر دے آؤں۔ پھر خیال آیا کہ شاید میرے لیے ہی ناہید نے یہ رومال گرایا ہو۔ اگرچہ یہ نری قیاس آرائی تھی پھر بھی اسے یقین ہو گیا کہ یہ رومال اس کے لیے ہی گرایا گیا تھا۔ رومال کے ایک کونے پر ناہید کا وہ نام لکھا تھا جو صرف کُنبے والے ہی جانتے تھے۔ وہ دیر تک اسی نام کو دیکھتا رہا۔ وہاں کبھی ناہید کی لمبی لمبی سفید انگلیاں بھی چھو گئی ہوں گی۔

اور جب وہ واپس آ رہا تھا تو اس نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی کوئی عہد نہیں کروں گا۔ اب تو ناہید کا رومال اسے مل گیا تھا جو اس نے خود دیا تھا۔ اس نے اپنے دِل کو ڈانٹ دیا کہ خبردار جو آئندہ ناہید کے خلاف کُچھ بھی سوچا تو۔

رات کو اس نے ناہید کو خواب میں دیکھا۔ ایک ملکہ کے روپ میں جس کا ہاتھ اس نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دیر تک ناہید کی وہی تصویر دیکھتا رہا جو اسے رسالے میں ملی تھی اور جو ہمیشہ اس کے سرہانے رکھی رہتی تھی۔ پھر وہ باغ میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ لمبے لمبے سرو کے درختوں کے پیچھے چاند طلوع ہو رہا ہے۔ آسمان کے اس حصّے میں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ درختوں کے ایک جھنڈ پر چند تارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ سرو کے سیاہ درخت بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ گھاس پر بیٹھ گیا جو اوس سے گیلی

تھی اور چاند کا انتظار کرنے لگا جو پتوں اور ٹہنیوں کی اوٹ میں چپکے چپکے طلوع ہو رہا تھا۔ اس کے دِل و دماغ میں ناہید بسی ہوئی تھی۔ شاید ناہید بھی اپنے باغ میں اس طرح گھاس پر بیٹھی چاند کی منتظر ہو اور شاید اسے یاد کر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی روز وہ ناہید بالکل ایسی ہی رات کو چاند کو طلوع ہوتے دیکھیں۔ اور جب ایسے رنگین لمحات آئے تو وہ ناہید سے بہت سی باتیں کرے گا۔ پہلے تو وہ اسے اپنے سارے خواب سنائے گا، اس کے بعد وہ ان نظاروں کا ذکر کرے گا جو اس نے تنہا دیکھے تھے۔ وہ ان برفانی چوٹیوں کی باتیں بتائے گا جو درختوں کے جھنڈ میں سے ابھرتی ہوئی آسمان سے جا ملتی ہیں، جنہیں چاند اور ستاروں کے راز معلوم ہیں، جو گزرتے ہوئے بادلوں سے سر گوشیاں کرتی ہیں۔ اور ان اونچے درختوں پر ایک سفید سی دُھند چھائی رہتی ہے۔ پھر وہ ان لدے بندے کُنجوں کی باتیں کرے گا جو دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف رنگ برنگے پھُولوں سے پٹے پڑے ہیں۔ جہاں سنہری دھوپ میں پھُول دِل کھول کر ہنستے ہیں اور طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلاتے ہیں۔ جہاں چاند کی کرنوں کے ساتھ پریاں اترتی ہیں اور ساری رات کھیل کر صبح کی سفیدی سے پہلے واپس چلی جاتی ہیں۔ پھر وہ ان صحراؤں کا ذکر کرے گا جہاں ریت کے سنہرے ٹیلوں پر کارواں گزرتے ہیں، جہاں ایسی ایسی آندھیاں آتی ہیں کہ دن رات میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ ان صحراؤں کی وسعت میں ایک عجیب سا فسوں ہے۔ بعض اوقات تو وہاں ناشاد

روحوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ جہاں اِکے دُکے جھلسے ہوئے درخت ہمیشہ آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ شاید گھٹاؤں کی اُمّید میں جو سرسبز خطوں پر برستی ہیں اور وہاں کبھی نہیں آئیں۔

پھر اپنی گزشتہ زندگی کی باتیں کرے گا کہ اب تک وہ کس قدر تنہا رہا ہے۔ قہقہوں میں اس کے آنسو نکل آیا کرتے تھے۔ چاروں طرف ویرانی تھی۔

اس کے بعد وہ ناہید کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر سورج، چاند اور تاروں کی قسم کھا کر کہے گا کہ وہ اس کی روح ہے، اس کی زندگی ہے، دنیا کی سب سے عزیز شے۔ وہ اسی طرح کی باتیں دیر تک سوچتا رہا صبح تک۔

اس کا آخری امتحان ہوا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اسے فوراً دوسری جگہ بلایا گیا، لیکن وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اسے پہلے پتہ ہوتا تو وہ فیل ہی ہو جاتا کیونکہ ابھی تو سب کُچھ نامکمل تھا۔ جو خواب یہ دیکھ رہا تھا ان کی تعبیر باقی تھی۔ چمکیلے دِن تو ابھی آنے والے تھے۔ چنانچہ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے کُچھ ایسا انتظام کیا جس سے یہ چند ماہ اور وہیں ٹھہر سکتا تھا لیکن پھر کُچھ نہ ہوا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس نے یہ راز بالکل پوشیدہ رکھا تھا، اپنے گہرے دوستوں سے بھی۔ ویسے ناہید کے گھر میں اس کی کسی نہ کسی طرح رسائی ہو سکتی تھی، لیکن جہاں وہ اس قدر بے وقوف تھا وہاں خوددار بھی تھا اور کسی کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ ادھر دن تھے کہ ایک

ایک کر کے گزر رہے تھے۔ آخر یہ مقررہ وقت بھی ختم ہو گیا اور اس کے جانے میں محض چند روز باقی رہ گئے۔

اب وہ کُچھ نڈر سا ہو گیا۔ دفعتاً نہ جانے اسے کیا سوجھی۔ وہ ایک خوبصورت سی سنہری انگوٹھی لایا جس میں بڑا نگینہ جڑا ہوا تھا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ چلتے وقت کسی نہ کسی طریقے سے یہ انگوٹھی ضرور ناہید کو دے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی اچھی سی تصویر نکالی اور ان دونوں چیزوں کو ایک کتاب میں رکھ کر اوپر ربن باندھا۔

اتوار کو وہ اپنے عزیزوں کے ہاں گیا اور کئی بہانوں سے ان خاتون کو ناہید کے ہاں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں بڑی دلیری سے ناہید کے کمرے میں پہنچا اور سنگھار میز کے دراز میں وہ کتاب رکھ آیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو بڑا مطمئن تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ انگوٹھی معمولی تحفہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ میرا دِل لپٹا ہوا ہے۔ میں نے اپنی روح کی پیشکش کی ہے۔

اور جب وہ روانہ ہونے لگا تو اس نے کسی کو خبر تک نہ ہونے دی کہ جا رہا ہے۔ البتہ کسی طریقے سے ناہید تک یہ بات پہنچا دی۔ اپنے دوستوں سے کُچھ نہ کہا، کیونکہ اسے اُمّید تھی کہ شاید ناہید مل جائے یا کُچھ کہلوا بھیجے۔ پہلے تو اس کا ارادہ ہوا کہ اپنے اسی دوست کے ہاں جائے۔ شاید وہیں کہیں راستے میں ناہید نظر آ

جائے لیکن کُچھ سوچ کر وہ اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ نہ جانے کس چیز نے اسے یقین دلا دیا کہ آج اس کی قسمت چمکے گی اور وہ خوشگوار حادثہ ضرور ہو گا جس کا اسے اتنے دنوں سے انتظار تھا۔ اس کا دِل کہتا تھا کہ آج ناہید اور وہ ضرور ملیں گے۔ وہ بڑی بے صبری سے انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ شام ہو گئی اور وہ چپ چاپ اسٹیشن چل دیا۔ راستے میں چاروں طرف ناہید کو ڈھونڈتا گیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر بھی اس کی اُمّید بدستور قائم تھی۔ ناہید کا انتظار بدستور تھا۔ لیکن جب ٹرین چلنے لگی تب اس نے سوچا کہ وہ اپنی عزیز ترین شے کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس سرزمین کو بھی جس سے ایسی حسین اور دلکش یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں قسمت ایسے ایسے دلچسپ حادثات لائی، جہاں اس کی روح کے ویرانے میں چپکے سے بہار آ گئی اور اب یہ سب کُچھ چھوڑتے وقت اسے کس قدر رنج ہو رہا تھا۔ نہ جانے کون اس کے دِل میں چُٹکیاں لے رہا تھا۔ نشتر چبھو رہا تھا۔ ایک بھیانک تاریکی چاروں طرف چھا رہی تھی۔ اس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔ دم گھُٹتا جا رہا تھا۔

وہ خزاں کی ایک اداس شام تھی۔ سہ پہر سے آندھی چل رہی تھی۔ بگولے اُٹھ رہے تھے۔ سوکھے پتّے ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ چاروں طرف جیسے درد برس رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔اس کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ جی ہلکا ہو جائے۔

لیکن وہ سنبھل گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ میری اپنی اداسی ہے جو ہر چیز میں جھلک رہی ہے۔ یہ میرے دِل کی ویرانی ہے۔ میری غمگین روح کی وحشت ہے۔ ورنہ یہ شام ایک معمولی سی شام ہے۔ ہر روز سورج ڈوبتا ہے۔ آندھیاں بھی آیا کرتی ہیں۔ بگولے اٹھتے ہیں۔ بہار کے بعد خزاں بھی آتی ہے۔ بھلا اس میں نئی بات کون سی ہے۔

مُجھے اداس نہیں ہونا چاہیے ہر گز رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے جس کی معصوم محبّت نے میرے دِل کو طرح طرح کی مسرتوں سے بھر دیا، اس کی ناشکری تو مجھ سے ہر گز نہ ہو گی۔ میں دیوانہ سا، آوارہ سا، ہمیشہ پریشان رہا کرتا تھا۔ ایک دن ناہید میری زندگی میں آ نکلی اور سب کُچھ بدل گیا۔ مُجھے ایک نئی زندگی مل گئی محبّت کی زندگی، جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

اور اب میں جا رہا ہوں تو کیا ہوا۔ نہ جانے قسمت کب مہربان ہو جائے اور چند خوشگوار حادثے ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئیں۔ وہی قسمت جو ناہید کو میری زندگی میں اچانک لے آئی کیا پتہ وہی ہمیں ایک دوسرے کا رفیق بنا دے۔ شاید بہت جلد مُجھے ایک معطّر لفافہ ملے جس میں ناہید کا محبّت بھرا خط ہو۔

اور وہ انگوٹھی جس کے ساتھ میرا دِل لپٹا ہوا ہے۔ جو ناہید اسے اپنی لمبی سی سفید انگلی میں پہن لے تو؟ اور شاید وہ پہن ہی ہے۔ وہ پھر میری تصویر؟ کیا پتہ کسی روز ناہید کے البم میں لگی ہوئی ہو ناہید کی تصویروں کے ساتھ۔

اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرانے لگا۔

اور جب ٹرین جا رہی تھی تب وہ کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ شاید کہیں ناہید نظر آجائے۔

عین اس وقت چند میل پرے ناہید اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی ننھی سی گھڑی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیارے چہرے پر نہ اضطراب تھا نہ بے چینی، بلکہ ایک عجیب سی بے پرواہی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ ٹرین چلی گئی ہو گی تب وہ اٹھی۔ ایک مرتبہ گھڑی کو پھر دیکھا اور بولی ''شکر ہے کہ جناب چلے گئے۔'' پھر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی لٹیں سنواریں، دوپٹہ درست کیا اور خوشبو کے لیے دراز کھولی تو اس میں سے وہی کتاب نکلی۔ ربن کھولا، صفحہ الٹا اور کھِلکھِلا کر ہنس دی۔ دریچہ کھول کر کتاب باہر پھینکنے لگی تھی کہ پھر کُچھ خیال آ گیا اور واپس لوٹ آئی۔ انگوٹھی کتاب سے نکل کر دریچے کے نیچے جا گری۔ اس نے مسکراتے ہوئے کتاب کو الماری کے پیچھے پھینک دیا۔

اتنے میں اس کی سہیلی آ گئی۔ ”بہت کھلی پڑتی ہو آج۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”نہ جانے بعض اوقات کوئی خواہ مخواہ کیوں احمق بن جاتا ہے۔ اور پھر جو حماقتیں کرتا ہے تو بس۔“

”کون کرتا تھا حماقتیں؟ کیسی حماقتیں؟؟“

”پتہ نہیں“ وہ ہنسنے لگی۔

اور وہ دونوں تاش کھیلنے لگیں۔

پھر اس کی سہیلی نے کہا: ”آؤ ذرا ہمارے گھر چلو کہو تو بیگم سے اجازت لے لوں۔“

ناہید پہلے تو تیار ہو گئی پھر اس نے دریچے کے پاس آ کر دیکھا تو آندھی چل رہی تھی۔ خشک پتّے ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔

وہ بولی: ”نہیں آج نہیں۔ یہ شام بڑی اداس اور ویران ہے۔ یہ آندھی، بگولے اور خزاں، سب کُچھ بہت بھیانک ہے۔ مُجھے ویرانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

اور وہ دونوں پھر تاش کھیلنے لگیں۔ اس وقت ناہید کا چہرہ بجلی کی روشنی میں جگمگا رہا تھا اور وہ اس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی کہ اگر کچھ پروانے ہوتے تو شاید اس کے چہرے کا طواف کرنے لگتے۔

کبھی کبھار کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ ناہید کے چہرے پر اداسی کا کوئی اظہار نہیں تھا۔ اب وہ طنز بھری مسکراہٹ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

اور اس دریچے کے نیچے سوکھی ہوئی ٹہنیوں اور پتّوں میں وہ انگوٹھی پڑی تھی جس کے چھوٹے سے نگینے میں کسی کی روح سمائی ہوئی تھی۔ کسی کا دِل مقید تھا۔

آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ انگوٹھی پر بے شمار خشک پتے گرتے گئے حتیٰ کہ وہ بالکل دفن ہو گئی۔

دُعا

بعض اوقات انسان سوچنے لگتا ہے کہ ہم دُعا کیوں مانگتے ہیں۔ ہماری خواہش ہمارے خیالات ہمارے دِل و دماغ کیا چیز ہے جو خُدا سے پوشیدہ ہے۔ جو کُچھ ہم سوچتے ہیں خُدا جانتا ہے۔ اس کے سامنے ہماری آنکھیں دو آئینے ہیں جن میں ہمارے سارے احساسات منعکس ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر جو پیغام ہم اپنے دِل کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں اس زبان پر کیوں لائیں؟ زبان پر لانے سے اثر جاتا رہتا ہے۔ وہ بات نہیں رہتی۔ احساسات اور ان کے اظہار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ہم دن میں کئی مرتبہ سوچتے ہیں لیکن ان کا اظہار مشکل ہے۔ اگر ہم انہیں الفاظ میں منتقل کرنا چاہیں تو صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔

یا تو یہ ہو کہ ہماری دعائیں بے حد مختصر ہوں اور بے غرض ہوں۔ بس ہم خُدا کو یاد کر لیا کریں۔ اس کی نعمتوں کا شکریہ اور اس کی عظمت اور جلال کا اعتراف کر

کے دُعا ختم کر دیں۔ یا ہمیں چاہیے کہ دوسروں کے لیے دعائیں مانگیں اور ہماری دعاؤں میں خود غرضی نہ ہو، بلکہ وسعت ہو۔

لیکن ہم عجیب و غریب دعائیں مانگتے ہیں۔ اگر کوئی پاس کھڑا اُسن رہا ہو تو ہنس ہنس کر دوہرا ہو جائے۔ آج ہم فلاں چیز مانگ رہے ہیں اور چند دنوں کے بعد کسی معمولی سے واقعہ سے متاثر ہو کر اسی چیز سے دور رہنے کے لیے دُعا مانگنے لگیں گے۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے دو بھائی مختلف دُعا مانگتے ہیں۔ ایک چاہتا ہے کہ آج بارش نہ ہو، یہ گھٹا صاف گزر جائے، ورنہ آج میچ نہیں ہو سکے گا۔ دوسرا چاہتا ہے کہ آج خوب موسلا دھار بارش ہو کیونکہ وہ اپنی منگیتر کے گھر جا رہا ہے اور اگر بارش رہی تو سارا دن وہاں گزار سکے گا۔

ادھر خُدا کو اپنے بندوں سے ایک جیسی محبّت ہے۔ کسے خوش کرے اور کسے ناراض۔

کبھی مدّت تک دُعا قبول نہیں ہوتی، خواہ دن میں سینکڑوں مرتبہ بھی دُعا مانگیں تب بھی کچھ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جو ہم مانگتے ہیں وہ در حقیقت ہمارے لیے بُرا ہوتا ہے اور خُدا جان بوجھ کر ہماری درخواست رد کر دیتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس دیر میں ہوتا ہے۔ اور کئی دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم شور و غل مچا کر خوب گڑگڑا کر دُعا مانگتے ہیں لیکن وہ الفاظ فقط حلق سے نکلتے ہیں دِل سے نہیں نکلتے۔

دِل کہیں اور ہوتا ہے۔ اگر ہم کوشش بھی کریں تب بھی دِل ساتھ نہیں دیتا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اور اسی دعاؤں کے ساتھ وہ دعائیں بھی رائیگاں جاتی ہیں جو خلوص سے مانگی ہوں۔

اور کُچھ دعائیں دیکھتے دیکھتے ہی قبول ہو جاتی ہیں۔ خواہ منہ سے ایک لفظ نہ نکلے۔ ہونٹ خاموش رہیں۔ ہم دِل ہی دِل میں خُدا سے سب کُچھ کہہ دیں اور خُدا اُسُن لیتا ہے۔ جب کبھی دُعا کے متعلق سوچنے لگوں تو ایک واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ دُعا کا خیال اور اس واقعے کی یاد آپس میں اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ جُدا نہیں ہو سکتے۔ اپنی سیاحت کی جتنی یادیں ذہن میں محفوظ ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔

جن دِنوں کا یہ ذکر ہے تب سردیاں تھیں اور میں سی پی کے جنگلوں میں گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ مانوس سا نام سُنا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نام کے ایک ڈاکٹر ہیں اور نزدیک ہی رہتے ہیں۔ پندرہ بیس میل کے سفر کے بعد وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب سے میری یونہی سی واقفیت تھی۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تو وہ اپنے آخری امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ اب وہ بڑے سنجیدہ اور مدبّر لگ رہے تھے اور چند بچّوں کے والد تھے۔ انہوں نے مُجھے ٹھہرا لیا۔ سارا دن سیر سپاٹے اور شکار میں گزرا۔ رات تھک کر سو جاتا۔ وہاں سے پانچ چھ میل پرے ایک نواب صاحب رہتے تھے۔ دراصل وہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ ڈاکٹر صاحب

جہاں تھے وہ اس ریاست کا سب سے بڑا قصبہ تھا۔ نواب صاحب نے اپنا محل سب سے اونچی پہاڑی پر خوشنما جگہ بنوایا تھا۔ محل کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ نواب صاحب کی تعریفیں سُن سُن کر میرا اشتیاق بڑھتا گیا کہ کسی طرح ان سے ملوں۔ لوگ بتاتے کہ ان کا محل اس قدر خوبصورت ہے کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لے وہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور بھی ایسی بہت سی باتیں سُنیں لیکن وہاں جانے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ ایک شام کو ہم تھکے تھکائے واپس آئے اور فوراً سو گئے۔ رات کو دو تین بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا نواب صاحب کا صاحبزادہ سخت بیمار ہے اور ڈاکٹر صاحب کو بلایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صبح بھی وہاں گئے تھے اور ملاحظہ کر کے دوائی دے آئے تھے۔ انہوں نے مُجھے بتایا کہ لڑکے کی حالت تشویشناک نہیں ہے، دراصل وہ لوگ گھبرائے ہوئے ہیں اسی لیے بار بار بلاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو ان کی جگہ میں چلا جاؤں مُجھے ان لوگوں سے ملنے کا بے حد شوق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت دے دی۔ باہر اندھیرا تھا اور بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ میں برساتی پہن کر ساتھ ہو لیا۔ جنگل کا پیچیدہ راستہ ہوا کے تیز جھونکے اور بوندیں، ہم کافی دیر کے بعد وہاں پہنچے۔ محل کے دروازے پر نواب صاحب نظر تھے۔ میں ان سے اور بیگم صاحبہ سے مل کر سیدھا ان کے لڑکے کے کمرے میں پہنچا۔ اسے اچھی طرح دیکھا۔ واقعی وہ لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ سب کو دلاسا

دیا اور انہیں ان کے کمروں میں واپس بھیج دیا۔ خود ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ نواب صاحب کا لڑکا چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ بیس بائیس سال عمر ہو گی۔ تیکھا ناک نقشہ، چہرے پر بھولا پن، نہ خوبصورت نہ بدصورت۔ صبح تک وہ بالکل نہ سو سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بولنے کی ممانعت کر رکھی تھی۔

صبح کو اس کی آنکھ لگ گئی اور دوپہر تک سوتا رہا۔ اس اثنا میں میں نے سارے محل کو اچھی طرح دیکھا۔ نواب صاحب کے کُنبے کے تمام افراد سے ملا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکے کا نام جاوید ہے۔ بی اے کر چکا ہے۔ نواب صاحب اور زیادہ پڑھانا نہیں چاہتے۔ اکلوتا لڑکا ہے اور سب کا لاڈلا ہے۔ اسے باہر بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ سال بھر سے یہیں ہے اور آج کل اسے ریاست کا کاروبار سکھایا جا رہا ہے۔ بڑا شرمیلا اور خاموش طبیعت ہے اور بے حد حساس ہے۔ یہاں سے کُچھ فاصلے پر نواب صاحب کے کوئی دوست رہتے ہیں جو بہت بڑے رئیس ہیں ان کا ارادہ ہے کہ ان کی لڑکی جاوید کے لیے مانگ لیں، لیکن جاوید بالکل چپ ہے کُچھ بھی نہیں بولتا۔ سارا سارا دن اکیلا بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔ نہ اسے شکار کا شوق ہے نہ ریاست کے انتظام کا۔ اتنے آدمی نواب صاحب سے ملنے آتے ہیں لیکن یہ سب سے دور دور رہتا ہے۔ اور یہ کہ نواب صاحب نہایت سخت طبیعت کے ہیں۔ لوگ انہیں سنگدل اور بے رحم کہتے ہیں۔ انہیں اپنے خاندان کی عزّت اور وجاہت کا بہت خیال ہے اسی لیے وہ بے حد مغرور

ہیں۔ وہ کسی کے ہاں ملنے نہیں جاتے۔ ان کے گنے گنائے دوست ہیں اور سب اونچے گھرانوں کے ہیں۔ اس جنگل میں بھی انہوں نے اپنے رسم ورواج کو نہیں چھوڑااور اس جاہ و جلال کو برقرار رکھا ہے جو بزرگوں سے انہیں ورثے میں ملا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے جس قدر محبّت کرتے ہیں اسی قدر سختی بھی برتتے ہیں۔ اپنا پیار کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ سب کام ان کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ کسی کو ان کے سامنے بولنے کی ہمّت نہیں۔

دوپہر کو میں جاوید کا پلنگ باہر دھوپ میں نکلوایا۔ دوائی دی اور کھانے کو کہا۔ اسے بھوک نہیں تھی، لیکن اس نے میرا کہنا نہیں ڈالا۔ اور ہم باتیں کرنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص مجھ سے بالکل مختلف ہے، ہماری عادتیں نہیں ملتیں، وہ گوشہ نشین ہے۔ میں سیّاح۔ ہمارے مزاج بھی مختلف ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنہیں میں پسند کرتا ہوں، لیکن پھر بھی نہ جانے اس میں کون کی خوبی ہے، وہ کیا جاذبیت ہے، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا، جو مُجھے اچھی معلوم ہوئی۔ شاید اس کی غیر مطمئن اور حساس نگاہیں یا کمزور سا دبلا پتلا جسم، کیونکہ مُجھے ہٹے کٹے اور مضبوط انسانوں کے بعد ایسے لوگ پسند ہیں جو بالکل ہی کمزور ہوں۔ انہیں دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کسی طرح ان کی حفاظت کریں۔ ان کے لیے کسی سے لڑ پڑیں حالانکہ یہ عجیب سا خیال ہے کسی سے خواہ مخواہ لڑ پڑنا۔ لیکن حقیقت ہے کہ بعض اوقات یہ خیال میرے دِل میں آتا ضرور ہے۔

سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب آئے اور دیکھ کر چلے گئے۔ جاوید کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی اور اسے بولنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی تھی۔

وہاں میں نے ایک بڑی سیدھی سادی لڑکی بھی دیکھی۔ نازک سی لڑکی جس کی آنکھوں میں ایسا خمار تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ کُچھ اسی حسین بھی نہ تھی لیکن ایسا معصوم چہرہ میں نے مدّتوں سے نہیں دیکھا تھا۔ نیچی نگاہیں، سمٹی سمٹائی، میلے کپڑے، بات بات پر، جی ہاں۔ ذرا ذرا دیر کے بعد وہ جاوید کے کمرے میں آجاتی تھی۔ رات کو جب جاوید سو گیا تو چپکے سے آئی اور سرہانے بیٹھ کر اس کا سر ہولے ہولے دبانے لگی۔ مجھ پر نیند کی غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ میں جب چونکا تو چار بجے تھے اور وہ لڑکی چپ چاپ بیٹھی جاوید کا سر دبا رہی تھی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ ٹکٹکی باندھ جاوید کو دیکھ رہی تھی۔

بمشکل اسے وہاں سے اٹھایا۔ صبح کو جاوید سے ذکر کیا، اس نے بتایا کہ یہ ان کی خادمہ ہے۔ زاہدہ نام ہے، اس کی والدہ بیگم صاحبہ کی باندی تھی۔ یہ چھوٹی سی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور بے چاری کی پرورش اچھی طرح نہ ہو سکی۔ نوکروں اور خادماؤں کی جھِڑکیاں، چاروں طرف کی لاپروائی، سخت سُست الفاظ، کسی نے کھانے پر ساتھ بٹھا لیا تو بیٹھ گئی ورنہ بھوکی رہتی۔ مدّتوں پیار بھرا بول نصیب نہ ہوتا۔ ذرا سے قصور پر سب کے سب ڈانٹتے۔ جب دیکھو کسی تنہا گوشے

میں چپ چاپ بیٹھی ہے، آنکھیں نمناک ہیں اور کُچھ سوچ رہی ہے۔ اب بھی اکثر غمگین رہتی ہے۔ بے چاری کو اپنی والدہ کے انتقال کا بڑا افسوس ہے۔ بیگم کبھی کبھار اچھی طرح بول لیتی ہیں ورنہ سب جھڑک کر بات کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت بے انصافی برتی جاتی ہے۔ جاوید کی ہم عمر ہے۔ بچپن میں اکٹھے کھیلے ہیں اسی لیے جاوید کا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہے۔ جاوید کو بھی اس پر بہت ترس آتا ہے لیکن کُچھ کر نہیں سکتا کیونکہ نواب صاحب نوکروں کو بالکل حقیر سمجھتے ہیں اور اگر جاوید یا کوئی اور ان کی حمایت میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نکال دے تو قیامت بپا ہو جائے۔ شاید زاہدہ نے اپنی زندگی میں ایک خوشی بھی نہیں دیکھی۔ شاید یہ بھی نہیں جانتی کہ خوش کس طرح ہوتے ہیں، مسرور ہونا کسے کہتے ہیں۔

اتنے میں وہ پھُولوں کے گلدستے لائی اور گلدانوں میں سجانے لگی۔ اس کا غمگین اور مظلوم چہرہ، پُر شفقت اور مہربان اس پر ایسی مردنی تھی جیسے کسی بُت کا چہرہ ہو۔ الجھی ہوئی لٹیں جن میں عرصے سے کنگھی نہیں کی گئی تھی۔ میلا سا دوپٹہ، اور ننھے مُنّے گورے گورے ہاتھ جو پھُولوں کو سجا رہے تھے۔ مُجھے بڑا ترس آیا۔ کیا واقعی اس غریب لڑکی نے آج تک ایک خوشی نہیں دیکھی۔ اس مُسکراتی ہوئی کائنات میں اس روشن اور پُر کیف دنیا میں جہاں ہر روز طلوعِ آفتاب کے

ساتھ مسکراہٹیں اور مسرّتیں تقسیم ہوتی ہیں وہاں اس لڑکی کا کوئی بھی حصّہ نہیں؟ کیا اسے ایک مخفی سی اُمّید یا ذرا سی مسرّت بھی نہیں مل سکتی؟

سارے محل میں صرف یہی چہرہ ہے جو مُرجھایا ہوا ہے ورنہ نواب صاحب کی لڑکیاں بھی تو ہیں جن کے چہرے زندگی کی حرارت سے یوں تپ رہے ہیں کہ پاس کھڑے ہونے پر آنچ آتی ہے۔ بیگم کی عمر کا اب عہدِ خزاں ہے لیکن اب بھی ان کے چہرے پر گزشتہ بہار کے آثار ہیں۔ جسے بھی دیکھو کُچھ امیدیں دِل میں لیے ہوئے ہے، لیکن یہ لڑکی سب سے مختلف ہے۔

جب وہ جا چکی تو ہم نے کُچھ باتیں شروع کر دیں۔ شکار کا ذکر چھڑ گیا۔ جاوید کہنے لگا: ”سچ پوچھو تو مُجھے شکار سے نفرت ہے۔“

میں نے وجہ دریافت کی تو بولا: ”اس لیے کہ مُجھے جانور اچھے لگتے ہیں۔ مُجھے حیوانوں سے پیار ہے اور سب سے زیادہ عزیز پرندے ہیں جو ہر صبح ہمیں طرح طرح کے نغمے سُناتے ہیں۔ ان کا مقصد ہمیں مسرور کرنا ہے۔ بغیر کسی معاوضے کے وہ ہمارے سامنے بیٹھ کر چہکتے ہیں۔ قسم قسم کے رنگین پروں سے سج کر سنگھار کر کے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ محض ہمارا دِل لُبھانے کے لیے۔ کتنا ظلم ہے کہ ہم ایک چھوٹے سے پرندے کو محض اس لیے مارتے ہیں کہ اس کے ننھے سے جسم سے ہماری غذا کا سامان ہو گا یا اس لیے کہ اس طرح ہماری تفریح ہو

گی۔ ہمیں ایک عجیب طرح کی غیر فطری خوشی ہوگی۔ کیونکہ شکار کو مار چُکنے کے بعد ہمیں اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہتی۔ میری نگاہوں میں تو یہ گناہ ہے۔ ہم پرندوں کے جانی دشمن ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم انہیں مار ڈالیں گے۔ وہ ہمارے پاس آ جاتے ہیں، پھُر سے اُڑ کر سامنے آ بیٹھتے ہیں اور سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ کتّے کو چاہو جتنا مارو جتنا بے رحمی سے چاہو پیٹو۔ جب تھک کر بیٹھ جاؤ گے تو وہ چپ چاپ آکر تمہارے قدموں میں سر رکھ دے گا۔ میں نے ایک کتّے کو دیکھا ہے اس لیے گولی سے مارا جا رہا تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اب خدمت کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کی ٹانگ زخمی ہوگئی لیکن ابھی تک جان نہیں نکلی تھی۔ تین دفعہ وار خالی گیا۔ اتنے میں اتفاق سے کتّے کی زنجیر ٹوٹ گئی اور وہ اپنے آقا کی طرف بھاگا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اب کاٹ کھائے گا لیکن نزدیک پہنچ کر کتّا زمین پر لیٹ گیا اور اپنے آقا کے قدم سُونگھنے لگا۔ تم نے غالباً کسی زخمی ہرن کی آنکھوں کو غور سے نہیں دیکھا۔ جب وہ مرنے لگتا ہے تو شکاری کو کیسی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہے کہ مُجھے تم سے ہرگز یہ اُمّید نہ تھی۔"

میں نے جلدی سے موضوع بدل دیا اور ہم سیاحت کی باتیں کرنے لگے۔ جب میں نے کہا کہ مُجھے سیاحت بے حد عزیز ہے تو اس نے اختلاف کیا۔ وہ بولا: "تم بہت ساری چیزوں کو ذرا ذرا سی دیر کے لیے دیکھتے ہو اور دیکھتے ہوئے تیزی سے

گزر جاتے ہو۔ اس خیال سے کہ شاید یہاں پھر کبھی واپسی نہیں ہو گی، لیکن میں جس چیز کو دیکھتا ہوں بہت قریب سے دیکھتا ہوں، حتیٰ کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں۔ تم محض دیکھتے ہو اور میں سوچتا ہوں۔ مُجھے قدرت کا قیمتی عطیہ فرصت میسّر ہے۔ میرے پاس کافی وقت ہے اور میں اسے بخوبی ضائع کر سکتا ہوں۔ سیّاح ہمیشہ بے چین رہتے ہیں، مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس بالکل وقت نہیں ہوتا۔ اور میں مطمئن ہوں۔ خوب مطالعہ کرتا ہوں، کتابوں کا، انسانوں کا، زندگی کا، قدرت کا اور کائنات کو میں نے بیشمار زاویوں سے دیکھا ہے۔ بے چینی سے مُجھے نفرت ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں نہ تو ہم ہر جگہ جاسکتے ہیں، نہ سب کُچھ دیکھ سکتے ہیں، تو پھر اس بے چینی کا مطلب؟

اس شرمیلے حساس اور خاموش طبیعت نوجوان کی گفتگو میں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ واقعی دنیا میں طرح طرح کی دلچسپیاں ہیں، رنگینیاں ہیں۔ نظارے ہمیں تلاش نہیں کرتے، ہمیں ان کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی مُجھے سیاحت پسند نہیں، لیکن میں ناشکرا نہیں ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب میرا سر اپنے معبود کے سامنے نہیں جھک جاتا اس کے احسانوں کا شمار نہیں۔ ہر صبح اُٹھ کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مُجھے بینائی جیسی نعمت بخشی، جس نے میری آنکھوں میں نور عطا کیا ورنہ یہی دنیا کتنی تاریک معلوم ہوتی؟"

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“ میں نے کہا۔ ”تم ایک ذہین اور قابل نوجوان ہو۔ تمہارے پاس سب کُچھ ہے۔ تم نہایت اچھے خاوند بن سکتے ہو۔ تمہارے دِل میں جو اچھے خیالات آتے ہیں وہ تنہائی میں ضائع ہو جاتے ہوں گے۔ اگر کسی کو اپنی تنہائی کا شریک بنالو تو تمہاری خوبیاں دُگنی ہو جائیں گی۔ اور پھر تمہیں کوئی نگران بھی تو چاہیے۔“

”اور تم اب تک کیوں تنہا ہو؟ تم بھی تو۔“

”میرا کیا ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ آج کُچھ سوچ رہا ہوں کل کُچھ اور خیالات، نظریے، یہاں تک کہ اصول تک بدلتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے آپ پر تعجب ہوتا ہے کہ اتنی فوری تبدیلیاں کیوں کر آ جاتی ہیں۔ جب مشکلیں درپیش ہوں تب بھی مُضطرب رہتا ہوں اور جب کوئی مشکل نہ ہو تو تب بھی پریشان رہتا ہوں اور پھر مجھ جیسے آوارہ گرد کا کیا اعتبار۔ لیکن تمہاری اور بات ہے۔ یہ تمام خوبیاں تم میں موجود ہیں جن کی تلاش لڑکیوں کو رہتی ہے۔“

”لیکن مُجھے اب تک وہ لڑکی نہیں ملی جس کی مُجھے تلاش ہے۔ میں خوبصورت نہیں ہوں اور نہ ہی مُجھے کسی حسین لڑکی کی تلاش ہے۔ میں اکثر بیمار رہتا ہوں۔ ویسے بھی کمزور ہوں، تنہائی پسند ہوں۔ اپنی خامیوں کو کسی کی محبّت میں چھپا لینا چاہتا ہوں۔ میں کہیں پناہ لینا چاہتا ہوں۔ شاید خود کسی کو ذرا سی محبّت بھی نہ دے

سکوں لیکن مُجھے بہت زیادہ محبّت چاہیے۔ ایسی محبّت جو سدا سر سبز رہے، جو ہمیشہ بڑھتی جائے، جو کبھی ختم نہ ہو۔ اتنی کہ چاروں طرف سے محبّت کی بارش ہونے لگے۔ میں محبّت میں دب کر رہ جاؤں،پِس کر رہ جاؤں۔ اور ابّا نے میرے لیے اپنے دوست کی لڑکی چُنی ہے جو حسین ہے، مغرور ہے، جسے اپنے سوا اور کسی کا خیال نہیں۔ جو شاید محبّت کے مفہوم سے بھی ناواقف ہے، لیکن میرے خوابوں کی لڑکی اس سے مختلف ہے۔ آج تک وہ مُجھے نہیں ملی، مدت سے اس کی تلاش ہے لیکن مُجھے اُمّید ہے کہ وہ ضرور مل جائے گی۔ جب وہ مل گئی تو ایک نئ زندگی شروع ہو گی۔"

دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ اس نحیف جسم کے اندر ایسا دِل تڑپ رہا ہے یہ مُجھے معلوم نہ تھا۔ اس کے خیالات کے سامنے میرے سب نظریے ہیچ معلوم ہونے لگے اور سچ تو یہ ہے کہ کُچھ کُچھ احساسِ کمتری ہونے لگا۔

میں چند روز اور وہاں رہا۔ جاوید کی باتوں کے علاوہ اگر مُجھے کسی نے متاثر کیا تو وہ زاہدہ تھی۔ غمگین اور اداس زاہدہ۔ غم شاید اس کے روئیں ہوئیں میں رچا ہوا تھا۔ غم اسکی روح میں حلول کر گیا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ بھی اس کی نگاہیں اونچی نہ دیکھیں۔ کبھی اس کے معصوم چہرے پر مسرت کی ننھی سی کرن تک نہ دیکھی۔ میں سوچا کہ یہ کب تک غمگین رہے گی؟ اس لڑکی کا مستقبل کیا ہو گا؟

کیا کبھی اس کے صبح شام بھی بدلیں گے یا یہ تنہائی اور غم کی اس دُھند میں اپنے دن گزار کر چپکے سے نظریں جھکائے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی؟

نواب صاحب کی لڑکیاں بے حد حسین اور جاذبِ نگاہ تھیں۔ مُجھے ان کا قرب بھی حاصل تھا۔ لیکن ان کا تمتمایا ہوا حُسن اور مسکراہٹیں مُجھے متوجّہ نہ کر سکیں۔ جتنی دیر میں وہاں رہا زاہدہ کے متعلق سوچتا رہا۔ مُجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ جی چاہا کہ اس کے لیے کچھ کر سکوں۔ جب وہاں سے لوٹا تو سب بڑے تپاک سے ملے۔ جب میں ایک دروازے سے گزر رہا تھا تو کواڑ کی اوٹ میں کھڑی زاہدہ ملی۔ اس نے ہاتھ ماتھے سے چھُو کر مُجھے سلام کیا، جیسے بے حد شکر گزار ہو، جیسے میں نے اس پر بہت احسان کیا ہو۔

جاوید جو اب بالکل تندرست تھا تھوڑی دور مُجھے چھوڑنے آیا۔

چند روز ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزار کر میں واپس چلا آیا۔

کُچھ عرصے کے بعد سب کُچھ بھول گیا۔ پھر وہی چوبیس گھنٹے کی مصروفیت اور کبھی ذرا چھٹی ملی تو جدھر کی دُھن سوار ہوئی نکل گیا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ ایک روز یکایک محسوس ہوا کہ میں تھک گیا ہوں اور اب مُجھے سیر کی ضرورت ہے۔ لمبی سی چھٹی لے کر سیاحت کے لیے تیار ہو گیا

اور نہ جانئے ڈاکٹر صاحب، جاوید اور زاہدہ سب کیوں کر یاد آ گئے، حالانکہ میں انہیں بالکل بھول چکا تھا۔ اس یاد نے میر اسارا پروگرام بدل دیا۔ میں سیدھا ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ ملتے ہی پہلا سوال نواب صاحب کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ آج کل محل میں ایک قیامت برپا ہے۔ زاہدہ اور جاوید کی محبّت کا چرچا سب کی زبان پر ہے۔ پہلے یہ ایک چنگاری تھی اور اب کُچھ اس طرح بھڑک اٹھی ہے کہ اس کے شعلے دور دور تک پہنچ چکے ہیں۔ زاہدہ پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں۔ اس کی زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ نواب صاحب کے غم و غصّے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ اس بے عزّتی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے جس سے ان کی عزّت خاک میں مل رہی ہے۔ خاندان کے جاہ و جلال میں فرق آتا ہے۔ بھلا وہ کسی طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا اکلوتا بیٹا ایک ادنیٰ سی خادمہ سے شادی کر لے۔ ایک حقیر باندی کی بیٹی کو یہ کیونکر بہو بنا سکتے ہیں؟ جاوید پر ان کا عتاب نازل ہے۔ وہ اس سے بے حد خفا ہیں اور انہوں نے کسی اور کی زبانی صاف کہلوا دیا ہے کہ اگر جاوید نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو وہ تمام عمر اس کی شکل نہ دیکھیں گے اور اسے ساری جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ لیکن نہ جانے یہ بات کیوں کر مشہور ہوئی۔ ان دونوں کی محبّت اب تک بالکل خاموش رہی تھی۔ آج تک ایک لفظ بھی اس کے مُنہ سے نہیں نکالا، نہ انہوں نے اس راز

میں کسی کو شریک کیا تھا۔ بس ویسے ہی یہ بات عام ہو گئی لیکن محبّت کے افشا ہونے کے لیے تقریر ضروری نہیں۔ یہ تو آنکھوں سے ہی جھلکنے لگتی ہے۔

یہ سُن کر میں بے چین ہو گیا۔ زاہدہ اور جاوید کی محبّت کیا سچ مچ جاوید اس غمزدہ اور معصوم سی لڑکی سے محبّت کرتا ہے۔ کیا واقعی زاہدہ کی تاریک دنیا میں اجالا ہوتا جارہا ہے۔ کیا واقعی اس کی صبح و شام بدلتے جارہے ہیں۔ کیا جاوید کو اپنے خوابوں کی ملکہ مل گئی ہے جس کی اسے تلاش تھی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ان دونوں سے ملوں، لیکن ان حالات میں وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بڑی خوشی ہوئی۔ زاہدہ کی زندگی میں محبّت طلوع ہوئی۔ ایک لڑکی کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ اس کا عزیز ترین سرمایہ ایسا بیش قیمت لمحہ جو فقط ایک بار ہی آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بعد میں اور باتیں بھی بتائیں کہ زاہدہ کی صحت گرتی جارہی ہے۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا جب وہ بیمار نہ ہوتی ہو اور جاوید کی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں۔ جہاں اسے زاہدہ سے دیوانہ وار محبّت ہے وہاں وہ ایک فرمانبردار اور نیک لڑکا بھی ہے۔ وہ نواب صاحب کے سامنے زبان تک نہیں ہلا سکتا۔ اس مسلے کا حل کیا ہو گا۔ کوئی نہیں جانتا۔ پھر اطلاع ملی کہ زاہدہ بیمار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بلایا تھا۔ میں بھی ساتھ گیا۔

اس مرتبہ مریض محل میں نہیں تھا بلکہ محل کے پچھواڑے ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی میں جس میں ایک سفید دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی۔ نہ کوئی ہمارا انتظار کر رہا تھا نہ کسی نے ہمارا استقبال کیا۔ کوٹھڑی میں ایک بوڑھی ماما ملی جو ہمیں دیکھ کر باہر چلی گئی۔

زاہدہ اندر بے ہوش پڑی تھی۔ یہ میلے کچیلے بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی میں مٹی کے تیل کی بو آرہی تھی اور چاروں طرف عجیب سی بے سروسامانی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے بغور معائنہ کیا۔ کُچھ دیر سوچتے رہے پھر مایوس ہو کر واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ زاہدہ کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ اس کے پھیپھڑے پہلے ہی کمزور تھے اور اب وہ سیّال مواد میں ڈوبے ہوئے تھے جس سے اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بہت دیر میں اطلاع بھیجی گئی۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم پچکاری سے وہ مواد کھینچ لیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اب سب کُچھ بے سود تھا کیونکہ اب زاہدہ کا چہرہ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ مریضہ کی زندگی ختم ہو رہی تھی۔ اس کے پھیپھڑے اس قدر ناکارہ ہو چکے تھے کہ اب کوئی علاج انہیں اصلی حالات پر نہیں لا سکتا تھا۔

لیکن میں نہ مانا۔ شاید اس لیے کہ میں نوعمر تھا اور مُجھے ان ہونی باتوں پر یقین تھا۔ میں نے اصرار کیا کہ میں ٹھہروں گا، سارے جتن کروں گا اور اگر کُچھ نہ ہوسکا تو اس وقت یہاں سے جاؤں گا جب مریضہ کے سانس ختم ہو چکیں گے۔

آخر ڈاکٹر صاحب مُجھے اپنا بیگ دے کر واپس چلے گئے اور میں زاہدہ کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ دبلی پہلی کمزور زاہدہ جس کی زندگی کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ سفیدی تھی نہ زردی، بلکہ ہلکی ہلکی نیلی جھلک آتی جارہی تھی جو موت کی نقیب ہوتی ہے۔

دفعتہً زاہدہ کے ہونٹ ہلے اور آہستہ سے اس نے کہا "جاوید۔"

جاوید وہاں نہیں تھا۔ شاید اسے وہاں آنے کی ممانعت تھی۔

وہ بے ہوشی کے عالم میں بول رہی تھی۔ "جاوید۔ جاوید۔" وہ مرنے سے پہلے اپنے محبوب کو ایک بار دیکھنا چاہتی تھی یا اس سے کُچھ کہنا چاہتی تھی جو اب تک نہ کہہ سکی۔ اسے کوئی ایسی امانت سپرد کرنا چاہتی تھی جو اس نے اب تک سنبھال کر رکھی تھی۔

میں نے اس کا سرد ہاتھ اپنی انگلیوں سے چھوا، نبض گننے کے لیے۔ میں کُچھ محسوس نہ کرسکا۔ اس کا دِل تھک کر خاموش ہونے والا تھا۔

"زاہدہ" میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "زاہدہ! بولو۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور مُجھے دیکھنے لگی۔

"زاہدہ!"

"جی" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"کیا بہت زیادہ درد ہے؟"

"جی۔ آپ کب آئے؟ اچھے تو ہیں؟"

"میں ابھی آیا ہوں۔ تم گھبراؤ مت۔ میں تمہیں تندرست کرنے آیا ہوں۔"

"لیکن مُجھے تو جینے کی کوئی خواہش نہیں۔ آج ہی رات میرے سانس تمام ہو جائیں گے۔ اس دن کی مُجھے بڑی آرزو تھی اور جب میں مر جاؤں گی تو نہ ہی مصیبتیں باقی رہیں گی اور نہ ہی ہمیشہ کا عذاب۔"

"تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ زندگی موت سے کہیں طاقتور ہے۔ پہلی مرتبہ جب یہاں آیا تھا تو جاوید کو تندرست کر کے گیا تھا اور اب تمہیں سنبھال لوں گا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔"

اس نے میری جانب پھر دیکھا۔ اس کی غمزدہ آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس پر غنودگی طاری ہو گئی آنکھیں بند ہو گئیں۔ بے ہوشی کے عالم میں اس نے پھر کہا۔ ''جاوید، جاوید۔''

جی چاہا کہ کہیں سے جاوید کو بلا لاؤں۔ دنیا کے دوسرے سرے سے اٹھا لاؤں اور اس کے سامنے لا کھڑا کروں۔

اتنے میں کوئی آیا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ نواب صاحب تھے۔ انہوں نے مُجھے اشارے سے بلایا۔ مختصر الفاظ میں میر امزاج پوچھا۔ آنے کا شکریہ ادا کیا اور پھر بولے: ''کیا اسے اسی وقت قصبے کے ہسپتال میں بھیجا جا سکتا ہے؟''

''ہاں! اگر یہ صبح تک زندہ رہی تب امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ اسے پہنچائیں گے کس طرح؟''

''ڈولی بھیج دیں گے۔''

''ڈولی میں؟ اس کی حالت بالکل نازک ہے۔ اتنے جھٹکے یہ برداشت نہ کر سکے گی۔''

''لیکن میں اسے اسی وقت بھیجنا چاہتا ہوں۔ نہ مُجھے اس کی بیماری کی پرواہے نہ اسکی موت کی۔ آپ نے شاید سب کُچھ سُن لیا ہو گا۔ اس لڑکی نے ہمارے ہاں آگ لگا دی ہے۔ ایک ادنیٰ باندی کی لڑکی نے ہمیں پریشان کر دیا ہے اور بد

قسمتی سے آج میرے عزیز دوست اور جاوید کے ہونے والے خُسر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہ بات انکے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔ ادھر وہ نامعقول لڑکا اس کے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ادھر یہ سارا دن اسے پکارتی رہی ہے۔ میں اپنے لڑکے کو عاق کر دوں گا لیکن اب اس سے باتیں نہیں کرنے دوں گا۔ اور پھر اس کمبخت کے ہونے والے خسر یہیں ہیں۔ کیا میں یہ تماشا انہیں دکھادوں؟"

میں چپ کھڑا تھا۔

"آپ اس وقت مُجھے ظالم اور سنگدل سمجھ رہے ہوں گے، لیکن میں یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہوں۔ اس ادنیٰ لڑکی کی یہ جرأت؟ آخر کیا سمجھ کر اس نے یہ گستاخی کی؟ اور اگر یہ لڑکا۔"

ان کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا اور وہ چلا کر بولے۔ "یہاں بلاؤ اس کمبخت کو، ابھی سب کُچھ طے ہو جائے گا۔ یہ لڑکی خواہ مرے یا جیے ابھی یہاں سے نکال دی جائے گی۔ اور جاوید کی زبان سے اسے یہ بھی سنوا دوں گا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

جاوید کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کا سارا کُنبہ۔ بیگم، لڑکیاں بچّے اور ایک سُرخ و سفید عمر رسیدہ شخص جو غالباً نواب صاحب کے دوست اور جاوید کے ہونے والے خسر تھے۔

نواب صاحب نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ ایک ڈولی کا انتظام کیا جائے۔ جاوید بت بنا کھڑا تھا۔ سہا ہوا، گھبرایا ہوا، جیسے وہ نواب صاحب کی ساری شرطیں قبول کر لے گا، جیسے یہ فوراً ہتھیار ڈال دے گا۔ ابھی ہار مان لے گا۔

نواب صاحب بولے۔ ”میں اس لڑکی کو قصبے کے ہسپتال میں بھیج رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس سے صاف صاف کہہ دو کہ تم اسے نہیں چاہتے۔ یہ تمہارے لیے اجنبی ہے۔ تمہیں اس کی پروا نہیں۔ تم اس سے نفرت کرتے ہو تا کہ اس کی رہی سہی غلط فہمی دور ہو جائے۔ غضب خُدا کا ایسے خاندان کا فرد ایک خادمہ کو پسند کرے۔ خدا جانے کس نے یہ افواہ پھیلا دی۔ بھلا یہ کہیں ممکن ہو سکتا ہے؟ خیر !اب بھی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ جاوید بیٹے تم اس کے پاس جا کر صاف صاف کہہ دو۔“

اور جاوید مٹّی کی مورت بنا ہوا چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ نواب صاحب کے سامنے آج تک اس نے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔

”جاوید!“ نواب صاحب چلّا کر بولے۔ ”سنتا نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ چل آگے بڑھ اور اس سے کہہ دے کہ تو اس سے نفرت کرتا ہے۔“ اور جاوید کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے وہ وہیں کھڑا تھا۔

”جاوید! کمبخت ناہنجار لڑکے! تو میری توہین کرتا ہے۔ ان سب کے سامنے تو میرا حکم رد کرتا ہے۔“ نواب صاحب غصّے سے کانپنے لگے۔ ”بچّوں کے سامنے تو میری توہین کر رہا ہے۔ اب آخری بار کہہ رہا ہوں حکم دے رہا ہوں اور اگر تو نے تعمیل نہ کی تو تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ عاق کر دوں گا۔ عمر بھر تیری شکل نہیں دیکھوں گا۔ چل آگے بڑھ اور اس لڑکی سے کہہ دے کہ تو اسکی ذرا پروا نہیں کرتا۔ تو اس سے نفرت کرتا ہے۔“

جاوید بدستور گم سم کھڑا تھا۔ دفعتہً اس نے زاہدہ کو دیکھا جو اب ہوش میں آ چکی تھی اور سب کُچھ سُن چکی تھی۔ اس کی نگاہیں جاوید کی نگاہوں سے ملیں اور جیسے جاوید پر بجلی کا لپکا آن پڑا۔ جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جیسے کسی نے اس شرمیلے اور کمزور جاوید کی جگہ ایک نیا دلیر اور بہادر جاوید لا کھڑا کیا جس کی نگاہیں زاہدہ پر جم گئیں۔ وہ کُچھ اس طرح آگے بڑھا جیسے اب اسے کسی کی پروا نہیں رہی اور وہ مقابلے کے لیے تیار ہے۔

پھر اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور بولا: ”کیا میں اسے نہیں پہچانتا؟ کیا میں اس سے محبّت نہیں کرتا؟ کون کہتا ہے؟ مُجھے اس سے محبّت ہے۔ آج سے نہیں برسوں سے میں اسے چاہتا ہوں۔ اگرچہ اب یہ سب کُچھ بے سود ہے۔ مُجھے یہ سب کُچھ پہلے کہنا چاہیے تھا لیکن میں بزدل بنا رہا۔ اب دیر ہو چکی ہے، لیکن کُچھ اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔ اگر یہ مر گئی تو آج میری تمنائیں اور آرزوئیں سب مر جائیں گی۔ میری روح مر جائے گی۔ اور میں آپ کے اس محل میں قدم بھی نہ رکھوں گا۔ میں سب کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ مُجھے آپ کے محل کی سنگلاخ اور اونچی دیواروں سے نفرت ہے۔ مُجھے آپ کی بناوٹی شان و شوکت سے نفرت ہے۔ مُجھے یہ محل بھیانک اور تاریک دکھائی دیتا ہے۔ اس میں انسان نہیں ہے۔ میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ مُجھے وہ جنّت نہیں چاہیے جو آپ نے میرے لیے تخلیق کی ہے۔ مُجھے آزاد کر دیجیے۔ مُجھے تنہا چھوڑ دیجیے۔“

اور نواب صاحب دم بخود رہ گئے جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو۔ جیسے ان کے کانوں نے انہیں دھوکہ دیا ہو۔ وہ بدستور کانپ رہے تھے لیکن ان کے دوست نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھال لیا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باہر لے گئے۔ آہستہ آہستہ مجمع کم ہونے لگا۔ ایک ایک کر کے سب باہر چلے گئے۔ اور میں نے زاہدہ کو دیکھا۔ غرور سے اس کا سر تَن گیا۔ اس کے نیلے ہونٹ یاقوت کی طرح سُرخ ہو گئے۔ اس کے گالوں پر سُرخی دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرتیں ناچنے

لگیں۔ وہ مُسکرائی۔ ایک غمزدہ اور بے کس لڑکی کی طرح نہیں بلکہ ایک مغرور اور فاتح عورت کی طرح اس نے محبّت جیتی تھی۔ عورت کی سب سے بڑی فتح۔ وفودِ محبّت سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اب شاید اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اب اسے کسی کا ڈر نہیں رہا تھا۔ شاید اسے موت کا بھی ڈر نہ رہا تھا۔

تب اس نے جاوید کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کو پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ تاریکیوں سے ایک دم اُجالے میں آکر اس کے آنکھیں خیرہ ہو گئی ہوں اور ان نگاہوں میں پیار، اعتماد اور شفقت سب کُچھ ملے ہوئے تھے۔

ایسے روپ میں میں نے زاہدہ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور نہ جانے میرے دِل میں اتنی ساری اُمّیدیں کہاں سے آ گئیں۔ مُجھے کُچھ یقین سا ہو گیا کہ اب یہ زندہ رہے گی۔ میں نے نبض دیکھی پہلے سے بہتر تھی۔ ایک آدمی ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیج دیا کہ انہیں فوراً بلائے۔ ایک رقعہ بھی دیا جس میں لکھا تھا کہ ہم ضرور وہ مواد پچکاری سے نکالیں گے۔ اس کے لیے سامان اور کئی اور دوائیاں بھی منگوائیں، جن کی اب ضرورت تھی۔

جاوید جو اب تک وہیں کھڑا تھا زاہدہ کے پاس بیٹھ گیا۔

میں باہر نکل آیا۔ رات کے دو تین بجے ہوں گے۔ آسمان پر سیاہ گھٹا تلی کھڑی تھی۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف بوندوں کا ہلکا ہلکا شور تھا جو اس خاموشی کو توڑ رہا تھا۔ درخت، پہاڑیاں، پودے، سب سیاہ لباس پہنے کھڑے تھے۔ چاروں طرف تاریکی تھی، سوائے اس نامعلوم سی روشنی کے جو اندھیری راتوں میں نہ جانے کہاں سے آ جاتی ہے۔ جب آسمان پر تارے بھی نہیں ہوتے اور زمین پر بھی اجالا نہیں ہوا پھر بھی ایک پر اسرار سی روشنی کہیں سے چُن چُن کر فضا میں سما جاتی ہے۔ اس ماحول میں میں نے اپنے آپ کو بے حد لطیف محسوس کیا۔ بالکل ہلکا پھلکا سا جیسے ابھی چاہوں تو اُڑتا ہوا فضا کو عبور کر کے کہیں پہنچ جاؤں۔

میں ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلا گیا۔ آگے جا کر ایک بلند ٹیلہ آیا۔ وہاں سے

محل دیکھا جس کی اونچی اونچی تاریک دیواریں بڑی ہیبت ناک معلوم ہو رہی تھیں جس کے برج اور کنگرے دیکھ کر دہشت آتی تھی جو سیاہی میں ملفوف تھا اور ایسا اُجاڑ اور ویران کھنڈر معلوم ہو رہا تھا جہاں کوئی انسان نہ رہتا ہو۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جہاں مدھم روشنی میں دو چہرے نظر آ رہے تھے۔ جو بے چینی سے طلوعِ

آفتاب کا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی رات ان کے لیے بڑی ڈراؤنی تھی جس کا ایک ایک لمحہ پہاڑ تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ کُچھ دیر پہلے زندگی ہار چکی تھی، لیکن اب دونوں حریف برابر تھے اور نتیجہ خُدا کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سب کُچھ میرے سامنے ہو رہا تھا اور زندگی کی جیت پر دونوں کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ اگر صبح زاہدہ نے طلوعِ آفتاب دیکھ لیا تو کل سے دو نئی زندگیاں شروع ہوں گی۔

اور جو سچ مچ زندگی جیت گئی تو؟ میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو بالکل تاریک تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس تنہائی اور ماحول میں مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خُدا کے سامنے کھڑا ہوں۔ جیسے وہ مُجھے دیکھ رہا ہو۔ یہ احساس بڑھتا گیا حتیٰ کہ مُجھے یقین ہو گیا کہ ان تاریک بادلوں کی اوٹ سے خُدا مُجھے دیکھ رہا ہے۔ تب میرا دِل دھڑکنے لگا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے، ماتھے پر پسینہ آگیا، ہونٹ خشک ہو گیا۔ میں مؤدب کھڑا ہو گیا اور میں نے ایک دُعا مانگی۔ نہ الفاظ میرے لبوں تک آئے نہ میرے ہونٹ ہلے۔ بس میں نے دِل ہی دِل میں دُعا مانگی کہ اے میرے خالق جب کبھی میں نے صدقِ دِل سے دُعا مانگی آپ نے قبول کی۔ آج میں مدّت کے بعد دُعا مانگ رہا ہوں۔ زاہدہ کی زندگی واپس بھیج دے۔ اس پر جو موت کا سایہ چھایا جا رہا ہے اسے ہٹا لے۔ اب اس لڑکی کو نہیں مرنا چاہیے۔ اب اس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ میں نے اتنے دنوں سے کچھ نہیں مانگا۔ ان ہی دِنوں

میں آپ سے اپنے لیے کُچھ مانگنے والا تھا، لیکن اب نہیں مانگوں گا۔ مُجھے اپنے لیے کُچھ نہیں چاہیے۔ میں سال بھر اپنے لیے کُچھ نہ مانگوں گا۔ صرف زاہدہ کو زندگی دے دے۔ اگر یہ دُعا قبول ہے تو مُجھے وہاں سے کوئی اشارہ کر دے۔ آسمان سے ذراسا اشارہ کر دے تا کہ میں سمجھ جاؤں۔

اسی طرح دیر تک میں کھڑا دُعا مانگتا رہا۔ اتنے میں یکایک ایک تاریک بادل چھٹا اور ایک جگمگ جگمگ کرتا ہوا تارہ جھانکنے لگا اور پھر جیسے اس تارے کی چمک بڑھتی گئی، حتیٰ کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ آسمان بالکل سیاہ تھا۔ بادلوں نے اسے اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اور ایک ننھی سی کھڑکی سے ایک چمکیلا تارہ رہ رہ کر مُجھے اشارے کر رہا تھا کہ تیری دُعا قبول ہوئی۔ تیری دُعا قبول ہوئی۔

ایک خط کے جواب میں

آج سہ پہر کو تمہارا خط ملا۔ جب میں نے سات سال کے طویل عرصے کے بعد ایک معطّر نیلے لفافے پر تمہارا مخصوص طرزِ تحریر دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ آج تک تم نے مُجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ کیا ہوا جو چھوٹے موٹے پُرزوں پر "ہاں" یا "نہ" لکھ دیا ہو۔ یہ تمہارا پہلا خط ہے۔ لفافہ دیکھتے ہی مُجھے یقین ہو گیا کہ اسے تم ہی نے لکھا ہے۔ کھولا تو واقعی تمہاری تحریر تھی۔ تم نے لکھا ہے کہ تم اگلے ہفتے یہاں سے گزرو گی اور میں تمہیں اسٹیشن پر ملوں۔ اس خبر نے میری افسردہ روح میں ہلچل پیدا کر دی، میرا رواں رواں مسرت سے ناچنے لگا۔ میرے پژمردہ لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں تو بالکل ناامید ہو چکا تھا۔ نہ جانے اتنے دنوں کے بعد تمہیں یکایک میرا خیال کس طرح آ گیا؟ یا شاید میں ان سارے دنوں تمہیں یاد رہا ہوں۔ اس خیال نے سرور طاری کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد میں مسرور ہوں۔ تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ آخر تم نے مُجھے یاد کر ہی لیا۔

میں نے سوچا کہ ضرور اپنے محبوب سے ملوں گا۔ اس جگمگاتے ہوئے چہرے کو ایک بار پھر دیکھوں گا اور اس مرتبہ اپنے دِل کے ظلمت کدے کو اس نور سے بھر لوں گا اور ان نقوش کو پھر تازہ کروں گا جنہیں وقت نے مدھم کر دیا ہے۔ شاید وہ خود فراموشی، وہ دلکش اور پیارے لمحے اور محبّت کی وہ سحر کاریاں پھر لوٹ آئیں۔

اس طویل عرصے میں تمہارے متعلق سنتا رہا ہوں۔ سنا ہے کہ تم اب اس قدر حسین معلوم ہوتی ہو کہ تمہارے چہرے پر نظریں نہیں جمتیں۔ کوئی تمہیں جی بھر کے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ جب میں نے تمہیں آخری مرتبہ دیکھا تھا تو تم ایک محجوب کلی تھیں۔ شرمیلی اور معصوم سی کلی، سادگی میں لپٹی ہوئی۔ اور اب ایک مہکتا ہوا شگفتہ پھُول بن کر جتنی رعنائیاں اور دلفریبیاں تم پر نچھاور ہوتی ہوں گی ان کا شاید اندازہ نہیں ہو سکتا۔

سنا ہے کہ اب تمہاری آنکھوں میں نرالی چمک ہے، نرالا فسوں ہے۔ تمہارے چہرے پر ایک ملکوتی حسن ہے۔ جب تم باتیں کرتی ہو تو سُننے والا کھو سا جاتا ہے۔ اب بھی تمہاری لٹیں چاند کی پیشانی پر پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ ننھا مُنّا سا تِل اب بھی تمہاری گردن پر ہے۔ اور سنا ہے کہ تم بے حد مسرور رہتی ہو۔ تمہیں زندگی کی سب خوشیاں میسر ہیں۔ دنیا کی سب نعمتیں تمہارے قدموں پر نثار ہیں۔

تمہارے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی ہے۔ تمہارے چہرے سے جیسے کرنیں پھوٹتی ہیں۔

میرا دِل مچلنے لگا۔ میں ضرور تمہیں دیکھوں گا اور ہم پرانی باتیں دہرائیں گے۔ کُچھ دیر اکٹھے بیٹھ کر ایک بار پھر ہنسیں گے۔ میں تو تمہارے چہرے کے نقوش واقعی بھولتا جارہا ہوں۔ ویسے وہ نقوش بدل بھی تو گئے ہوں گے۔ پہلے تم کبھی کبھار غمگین بھی ہو جاتی تھیں لیکن جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے سنا ہے کہ تم ہر وقت خوشیوں میں گھری رہتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر کیسا مرعوب ہو کر رہ جاؤں گا۔

میں ضرور سیاہ شیروانی پہن کر تم سے ملنے آؤں گا۔ اپنے بال پریشان کر کے کیونکر یہ دونوں چیزیں تمہیں پسند تھیں۔ میں مُسکراتا ہوا اٹھا۔ سیاہ شیروانی نکال کر پہنی، اپنے بال ماتھے پر پریشاں کیے۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے عکس کو دیکھنے لگا۔ اس شیروانی میں اب میں کُچھ اور طرح کا دکھائی دیتا ہوں۔ میں گھور گھور کر اپنا عکس دیکھنے لگا۔ اتنے غور سے جیسے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں بدل گیا ہوں۔ دفعتاً میرے چہرے کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ مسرتوں پر دُھند سی چھا گئی اور وہ نوزائیدہ اُمنگیں مرجھا کر رہ گئیں۔ نہ جانے کتنی دیر تک اپنے آپ کو اسی طرح کھڑا دیکھتا رہا۔ کیا یہ وہی معصوم چہرہ

ہے جو تمہیں پسند تھا۔ کیا یہ وہی آنکھیں ہیں جن میں محبّت جھلملاتی تھی۔ کیا یہ وہی پیشانی ہے جس پر پاکیزگی کی جلا تھی۔ کیا یہ وہی شبیہ ہے جو آج سے سات سال پہلے تھی جب ہم آخری مرتبہ ملے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ آنکھیں کُچھ افسردہ سی ہیں جن میں وحشت جھلملا رہی ہے۔ یہ چہرہ کُچھ بدلا ہوا سا ہے۔ یہ ہونٹ اب ملوث ہو چکے ہیں۔ اور یہ پیشانی جس سے ایک مرتبہ تمہارے ہونٹ چھو چکے ہیں اب ایک میلے اور شکستہ آئینے کی طرح ہے۔ اب میرے دِل پر ایک سیاہ خول ہے جسے مسرت کی کرنیں عبور نہیں کر سکتیں۔ اور میں کیسا اجنبی سا معلوم ہو رہا ہوں، پہلے سے بالکل مختلف۔ کیا میں اسی طرح تمہارے سامنے چلا آؤں؟ تم مُجھے پہچانو گی نہیں۔ تم سہم جاؤ گی شاید مجھ سے نفرت کرنے لگو۔

اگر تم اجنبی ہوتیں تو میں بلا دھڑک تمہارے سامنے آ جاتا، لیکن تم اجنبی نہیں ہو۔ اگرچہ اب تو میں تمہیں اپنا دوست بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ اب تم کسی اور کی ہو چکی ہو۔ لیکن میرے خیال میں اب بھی میرا تمہارا کوئی رشتہ ہے، خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو۔ اسی لیے میں تمہارے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ اور شاید تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے میری روح کس قدر بے قرار ہے۔

لو اب تمہیں اپنی رام کہانی سناؤں۔ جب تمہاری شادی ہوئی اس وقت سے اب تک۔ اس طویل عرصے میں تم کس قدر یاد آئیں! یہ شاید پوری طرح بیان نہ کر سکوں۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل مُجھے تمہاری ضرورت رہی ہے۔ فقط ایک حسین و جمیل مورت کی نہیں بلکہ ایک پُر شفقت اور مہربان رفیق کی، ایک نگران کی، ایک رہنما کی۔ لیکن تم نے مُجھے بھی یاد نہیں کیا۔ ذرا سی اُمّید بھی نہیں دلائی۔ اگر مُجھے فقط اس قدر معلوم ہو جاتا کہ تم نے مُجھے اب تک نہیں بھلایا تو میں بالکل ویسا ہی رہتا۔ ہر گز یہ تبدیلیاں مجھ میں نہ آتیں۔

میں اکثر بہک گیا ہوں، بلندیوں سے نیچے گر گیا ہوں۔ جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتا پھرا ہوں۔ اور قسمت نے مُجھے اکثر دھوکا دیا ہے۔

لیکن مُجھے ہمیشہ تمہارے خط کا انتظار رہا۔ نہ جانے کیوں بس ویسے ہی انتظار کرتا رہا۔ خواہ تم کُچھ نہ لکھتیں۔ مُجھے محبّت بھرے فقروں کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی میں اپنے زخموں کے لیے مرہم چاہتا تھا۔ صرف یاد کر لیتیں، خواہ ایک سادے سے پرزے پر اپنا نام لکھ کر بھیج دیتیں۔ میرے لیے وہی کافی ہوتا۔

اس عرصے میں زندگی میں بڑے بڑے طوفان آئے۔ میرے قدم اکھڑ اکھڑ گئے۔ میں نے کوئی مدافعت پیش نہ کی، بھلا کرتا بھی تو کس برتے پر۔ جدھر ریلا بہا کر لے گیا اسی طرف بہہ گیا اور جب کبھی تھک ہار کر بیٹھا تو تمہارے خط کا

دوبارہ انتظار کرنے لگتا۔ شروع شروع میں تو سچ مچ بہت خبط رہا۔ جب ڈاک کا وقت آتا تو دِل دھڑکنے لگتا اور جب ڈاک آ چکتی تو کُچھ دیر مایوس ہو کر پھر اگلے روز کے لیے امیدیں بندھنی شروع ہو جائیں۔ یہ اُمّید کم بخت کس قدر ظالم چیز ہے۔ یہ ہمیشہ ستاتی ہے۔ دِل کو سمجھالو لیکن اُمّید پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اور جب مدتوں تک تمہارا خط نہیں ملا تو میں نے سمجھ لیا کہ تم مُجھے بھول گئی ہو اور شاید تمہیں کبھی میرا خیال تھا ہی نہیں۔ اس کے بعد میں بے پرواہو تا گیا۔ نہ اپنی پروا تھی نہ کسی اور کی۔ آہستہ آہستہ اپنے سب اصول بھولتا گیا۔ ہر ایک چیز سے عقیدہ اٹھ گیا۔ بھلائی برائی سے، رنگ اور خوشی سے، دعاؤں سے، یہاں تک کہ بعض اوقات یقین سا ہو جاتا کہ اس نیلے آسمان کے اوپر ایک خلا ہے جہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ہمیں کوئی دیکھتا ہے اور نہ ہماری دعائیں وہاں تک پہنچتی ہیں۔ اگر پہنچ بھی جائیں تو وہاں بسنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ سارا کارخانہ خودبخود چل رہا ہے۔

میں محبّت کا بھوکا تھا۔ جب میں اسے جیت نہ سکا تو محبّت مانگنی شروع کر دی۔ جب محبّت بھری نگاہوں سے حسین چہروں کو گھورنا شروع کیا تو بہت سی آنکھیں میری طرف دیکھنے لگیں۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں میری باتوں میں خلوص تھا۔ چہرے پر بھولا پن تھا اور آنکھوں میں معصومیت تھی۔

ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کی طرف لپکنے لگا۔ اس تپتے ہوئے صحرا میں فرضی نخلستان بنا کر اپنے دِل کو دھوکا دیا کرتا اس اُمّید میں کہ کہیں محبّت کا سہارا نصیب ہو جائے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک تنہا ہوں۔ کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو مُجھے اس قدر محبّت دے سکتی جتنی تم نے عطا کی، جو مُجھے اتنی مسرتیں اور ہمدردی دے سکتی۔ اور اب سب لڑکیاں ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ خدوخال میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ باقی خیالات، گفتگو، عادتیں سب ایک جیسی۔ اتنی لڑکیوں میں سے مُجھے کسی میں تمہاری ذرا سی جھلک بھی دکھائی نہ دی۔ ویسے خبط سب کا رہا۔ کسی کا چند ہفتے اور کسی کا چند روز۔ مُجھے طرح طرح کے تحفے ملے۔ قسم قسم کے نذرانے اور پیشکش، محبّت بھی ملی اور نفرت بھی، لگاوٹ بھی اور بے رُخی بھی۔

اور ایک دفعہ تو ایک لڑکی سے کُچھ کہنے ہی لگا تھا۔ تمہارے بعد اگر کسی نے سچ مچ مُجھے چاہا ہے تو اس نے۔ اس کی محبّت بے لاگ تھی۔ اس نے ناز برداریاں کیں، ہمت بندھائی، مُجھے خوش دیکھنا چاہا۔ ایک رات جب نیا نیا چاند درختوں کی اوٹ میں چھپا جا رہا تھا تو اس نے اپنے آنسوؤں سے میرا دامن بھگو دیا۔ تب میں نے سوچا کہ آج اسے چن لوں۔ لیکن نہ جانے اس وقت اچانک تمہارا خیال کیوں کر

آ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹ سی لیے اور ایک لفظ تک نہ کہا۔ شاید وہ رات کی رانی کی مہک تھی یا نیا نیا چاند جس نے تمہاری یاد دلا دی۔ پھر مُجھے تمہاری ایک سالگرہ یاد آ گئی۔ اس روز میں بخار میں تپ رہا تھا۔ مجھ میں چلنے کی طاقت نہ تھی۔ ہمارا راز افشا ہو چکا تھا۔ اس لیے مُجھے تمہارے ہاں آنے کی سخت ممانعت تھی۔ شام کو کسی نے مجھ سے کہا کہ آج تمہاری سالگرہ ہے اور تمہارے ہاں پارٹی ہے۔ تم نے نہایت پیارا لباس پہن رکھا ہے اور تم اتنی پیاری معلوم ہو رہی ہو کہ تمہاری سہیلیاں تمہیں بار بار ٹوکتی ہیں۔ یہ سن کر دِل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا۔ تمہاری سالگرہ تھی اور تم مُجھے بھول گئیں۔ نہ تم نے بلاوا بھیجا نہ کوئی پیام۔ میں کُچھ دیر کے لیے تم سے رُوٹھ گیا لیکن پھر نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ چپکے سے اُٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ چوری چوری تمہاری کوٹھی میں پہنچا۔ وہاں ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تم اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھیں۔ جیسے ستاروں میں چاند تاباں ہو۔ میں بُت بنا تمہیں دیکھتا رہا۔ تم پہلے اتنی خوبصورت معلوم نہیں ہوئی تھیں۔ اور پھر وہ کون سی کشش تھی جو تمہاری نگاہوں کو کھینچ کر کھڑکی تک لے آئی۔ ہماری نظریں ملیں، میں نے اشارہ کیا اور تم معذرت کر کے باہر آ گئیں۔ ہم چپ چاپ درختوں کے جھنڈ میں چلے گئے۔ میں نے تمہاری گود میں سر رکھ دیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر تم نے میرا سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں جیسے کُچھ تلاش کرنے لگیں۔ دیر تک مُجھے اس

طرح دیکھتی رہیں، ایک لفظ بھی ہمارے ہونٹوں سے نہیں نکلا۔ تمہاری آنکھوں میں کتنی ہمدردی تھی کتنا پیار تھا۔ پھر تم نے میری پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس وقت مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک ننھا سا بچّہ ہوں اور ایک معمّر خاتون کی گود میں بیٹھا ہوں جو میری نگران ہے۔ میں نے تمہاری گود میں سر چھپایا۔ مُجھے پاکیزہ ترین چیزوں کی قسم ہے کہ وہ پُر شفقت بوسہ اب تک نہیں بھولا۔ اور مُجھے وہ لمحے بھی یاد ہیں جب تم زرق برق لباس پہنے میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ تم نے پھُولوں کے گجرے اور ہار پہن رکھے تھے۔ نیا نیا چاند درختوں کی اوٹ میں چھپا جا رہا تھا اور ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔

اور بھی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ ایک مرتبہ جب ہم اسی جھنڈ میں واپس جانے لگے تو تم نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ چلوں، لیکن چونکہ ان دنوں ہماری ملاقاتوں کا ہر جگہ چرچا تھا اس لیے میں جھجک کر رہ گیا۔ اور جب تم خُدا حافظ کہہ کر اکیلی چلی گئیں تو بہت پچھتایا۔ معمولی سی بات تھی۔ اگر میں تمہیں چھوڑ آتا تو اس میں کیا حرج تھا۔ یہ تمہارا حکم تھا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ تمہیں چھوڑنے جایا کرتا لیکن وہ پچھتاوا بدستور رہا۔ کاش میں تمہارے ساتھ چلا جاتا۔

اور پھر ایک روز مُجھے معلوم ہوا کہ تمہارا سارا کُنبہ کسی تقریب پر گیا ہوا ہے۔ مُجھے یقین تھا کہ تم ضرور اپنے کمرے میں ہو گی اور تمہیں میرا انتظار ہو گا۔ تم مُجھے

وہیں ملیں لیکن تم سو رہی تھیں۔ میں نے تمہیں جگایا نہیں۔ تب پہلی مرتبہ تمہارے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس سے پہلے جب کبھی تمہاری طرف دیکھا تھا تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور محض چند لمحوں کے بعد نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ میں فقط ایک جھلک ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس دفعہ جی بھر کر تمہیں دیکھا اور نیند میں تم کیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ جیسے کوئی شریر لڑکی کھیل کود کے بعد تھک کر سو گئی ہو یا کسی محبّت کی ماری ہوئی بے قرار حسینہ کی اپنے محبوب کا انتظار کرتے کرتے آنکھ لگ گئی ہو یا جیسے کوئی پُر تمکین اور مغرور ملکہ تخت پر آنکھیں بند کیے سوچ رہی ہو۔ اس وقت تمہیں طرح طرح کے روپ میں دیکھا۔ پھر مُجھے یاد آ گیا کہ بعینہٖ ایسی تصویریں بچپن میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ امّی کی گود میں آنکھیں بند کر کے یا سوتے میں۔ لڑکپن میں میرے خوابوں میں اکثر یہی مورت بار بار آئی۔ اور پھر چپکے سے تم نے آنکھیں کھول دیں۔ شاید میری نگاہوں کی تپش نے تمہیں بیدار کیا۔ کیا تمہیں احساس ہو گیا کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ مُجھے دیکھ کر تم مُسکرائیں اور وہ مسکراہٹ میری پتلیوں میں سما کر رہ گئی۔

جہاں تم نے مُجھے اتنی مسرتیں عطا کی تھیں، وہاں تھوڑی سی اُمّید بھی دے دیتیں تو میں کبھی نہ بہکتا۔ اور شاید ساری زندگی ان مسرور لمحوں کی یاد میں گزار دیتا جو تمہارے قریب بسر ہوئے تھے۔ فقط اتنی سی اُمّید کہ تم مُجھے یاد رکھو گی۔

زندگی کا شکست خوردہ نظریہ مُجھے پسند نہیں تھا۔ مُجھے اس کے خیال ہی سے نفرت تھی۔ میری تمنّا تھی کہ ستارے نوچ لاؤں۔ سمندروں کو ہیرے موتیوں کے لیے کھنگال دوں۔ وقت کے سیل کو روک لوں۔ خود بھی ہنسوں، اوروں کو بھی ہنساؤں۔ جتنی نعمتیں اس آسمان کے نیچے ہیں ان سب کو ڈھونڈوں۔ لیکن بعد میں یہ نظریہ ختم ہو گیا۔ پہلے میں بہت حساس تھا۔ ایک دفعہ تمہارے لیے پھُول لایا اور تم نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس لیے کہ سب کے سامنے پھُول پیش کر رہا تھا۔ اور مُجھے اتنا رنج ہوا کہ ہفتوں میرا چہرہ اترا رہا۔ لیکن چند سال بعد میں نے ایک ہار کسی کو پیش کیا اور جب اس نے لینے سے انکار کر دیا تو مُجھے ذرا افسوس بھی تو نہیں ہوا۔ وہ ہار سنبھال کر رکھ لیا کہ کسی اور کو دے دوں گا۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ میرا دِل پتھر کا بن گیا ہے جسے اب محبّت کا احساس تک نہیں ہوتا، جو شفقت اور ہمدردی کھو چکا ہے۔ نہیں۔ اب بھی مُجھے محبّت ہے، پیار ہے، لیکن اس میں فرق آ گیا ہے۔ پہلے میری محبّت ایک بہت بڑی جھیل کی طرح تھی جو چاروں طرف سے بند تھی، جس کی لہریں ساحل سے ٹکرا کر واپس آ جاتیں اور خاموش ہو جاتی تھیں۔ اب میری محبّت مختلف چشموں میں بہتی ہے ایسے چشمے جو کبھی خشک نہیں ہوتے۔ ہمیشہ رسیلے نغمے گاتے ہوئے بہتے رہتے ہیں۔ یہ چشمے کئی ہیں اگر اتفاق سے ان میں سے ایک آدھ سوکھ جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب مُجھے دکھ سے الفت ہے، بے کسی سے پیار ہے، رنج و غم سے محبّت

ہے۔ اب مُجھے غمگین داستانیں اچھی لگتی ہیں۔ اب مُجھے ویرانے پسند ہیں۔ پہلے صرف حسین دِل کو لُبھاتے تھے اور اب پھیکے اداس اور اُترے ہوئے چہرے بھاتے ہیں۔ پہلے صرف تمہیں حاصل کرنے کی آرزو تھی، فقط یہی زندگی کا مدعا تھا، لیکن اب شاید کوئی شے بھی مُجھے مطمئن نہیں کر سکتی۔ اب ہر وقت ایک بے چینی سی سوار رہتی ہے۔ ایک ہیجان سا رہتا ہے تجسس سا۔

پچھلے سال جب میں پہاڑ پر تھا تو ایک رات سخت برفباری ہوئی۔ مکان درخت سڑکیں سب برف سے سفید ہوگئے۔ علی الصبح جب میں پوستین میں لپٹا ہوا باہر نکلا تو ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ننگے تھے۔ اس نے پیروں پر ٹاٹ باندھ رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے پاس جوتے نہیں ہیں۔ جتنے روز میں وہاں رہا اس خیال نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ رہ رہ کر وہی تصویر میرے سامنے آجاتی۔ برف میں ایک گھرا ہوا شخص جس کے پاس جوتے نہیں تھے۔ پھر ایک مرتبہ ہوٹل میں ایک شخص کو دیکھا جس نے بہت قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ یہ ڈرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار ایک خط نکال کر پڑھتا اور اس کا چہرہ زرد ہو جاتا۔ میں بے چین ہو گیا، کتنا جی چاہا کہ لپک کر اس کے ہاتھ سے خط چھین لوں اور وجہ پوچھوں لیکن جھجک گیا۔ شاید وہ برا مان جائے۔ اس شخص کی تصویر میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔

ایک اور دن میں نے ایک اندھے بچّے کو دیکھا جو اپنی ماں کی گود میں بیٹھا تتلیوں اور پھولوں کی باتیں کر رہا تھا۔ بد قسمتی سے وہ ایک مرتبہ دنیا کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اس نے طرح طرح کے رنگ دیکھے تھے اور سورج کی روشنی نے اس کی آنکھوں کو ایک دفعہ منوّر کیا تھا۔

جب اس کی ماں نے ایک پھُول اس کے ہاتھ میں دے کر کہا ننھے اس پھُول کا رنگ سُرخ ہے، تمہاری ننھی بہن کے ہونٹوں کی طرح تو وہ کھِلکھِلا کر ہنس پڑا۔ اس کی وہ ہنسی اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ ایک اندھے بچّے کی ہنسی۔

اور ایک مرتبہ میں نے ایک ضعیف مریض کو دیکھا جسے ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے کر کہہ دیا تھا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر مر جائے گا۔ میں اکثر اس کے کمرے میں جایا کرتا۔ اس نے اپنی گھڑی مُجھے مرمت کے لیے دی اور تاکید کی کہ کسی اچھے کاریگر سے مرمت کرا کر لاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ گھڑی بگڑ جائے۔

ایک شام کو جب میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ کھڑکی سے غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا اور اس قدر منہمک تھا کہ اسے میرے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ نہ جانے وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی زندگی کی

شام دیکھ رہا تھا۔ زندگی کی آخری کرن کو ظلمتیں ڈھانپ رہی تھیں۔ اسے چاندنی بے حد پسند تھی۔ چاندنی راتوں میں وہ باہر چلا جاتا اور اسے بمشکل کھینچ کھینچ کر برآمدے میں لاتے تھے۔ جس شام اس کی حالت نازک ہوئی اسی روز سہ پہر کو وہ آہستہ سے میرے کان میں بولا: "یہ میری آخری التجا ہے۔ آج چاند کی چودھویں ہے اور پورا چاند طلوع ہو گا۔ میں شاید اس وقت تک زندہ نہ رہ سکوں۔ چاند ان درختوں سے طلوع ہو گا۔ اگر آج رات میرا بلاوا آ جائے تو تم میری آنکھیں بند نہ کرنا۔ اس برآمدے کی چِک اُٹھا دینا۔ آج چاندنی خوب چھلکے گی۔ اگر میری آنکھیں کھلی رہیں تو میں ضرور دیکھوں گا۔ خواہ میرا دِل خاموش ہو، ہاتھ پاؤں بے جان ہو چکے ہوں لیکن آج رات میں چودھویں کا چاند ضرور دیکھوں گا۔" اسی رات اس کا انتقال ہو گیا۔ میں نے نہ اس کا چہرہ ڈھانپا اور نہ آنکھیں بند کیں اور برآمدے کی چِک اٹھا دی۔ درختوں میں سے چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا تھا اور جیسے وہ سچ مچ دیکھ رہا تھا اپنی بے نور آنکھوں سے۔ وہ بے جان آنکھیں واقعی چاند کو گھور رہی تھیں۔ ایسا نظارہ اگر میں دیکھتا تو ضرور ڈر جاتا لیکن اب تو ایسی باتیں اپنے دِل میں چھپا لیتا ہوں اور انہیں بھی حفاظت سے رکھتا ہوں۔ شاید میں اب دلیر ہو گیا ہوں۔ زمانے کے تھپیڑوں نے آداب بتا دیئے ہیں۔ زندگی کی ٹھوکروں نے مُجھے راہ چلنا سکھا دیا ہے۔ اب اگر کوئی مُجھے تاریک ویرانے میں چھوڑ دے جہاں تنہائی ہی تنہائی ہو اور سیاہ گھٹا تُلی کھڑی ہو

اور نیچے کانٹے اور حشرات الارض ہوں، وہاں بھی میں بغیر کسی اُمّید کے زندہ رہ سکتا ہوں۔ میرے لبوں سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔

ویسے کبھی کبھی ایک ننھی سی موہوم سی اُمّید دِل میں آیا کرتی ہے اور میں سوچا کرتا ہوں کہ کیا ہوتا جو تم مُجھے مل جاتیں۔ وہ زندگی کتنی شیریں ہوتی، وہ لمحے کسی قدر جانفزا ہوتے۔ یہ اداس دنیا نعمتوں اور مسرتوں سے لبریز ہو جاتی۔ مانا کہ میں زندگی کا صرف روشن پہلو ہی دیکھ سکتا لیکن یہ سارا وقت ایک سہانے خواب میں گزر جاتا اور ایسے خواب تو کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔ یہ خواب تو نایاب ہیں۔ غمگین خواب بھول جائیں تو بھول جائیں لیکن مُسکراتے ہوئے رنگین خواب یاد رہتے ہیں۔ تب شاید زندگی کی تلخیوں کا احساس نہ ہوتا۔

یہ خط بہت طویل ہو گیا۔ تمھیں پہلے بھی مجھ سے یہ شکایت رہتی تھی کہ میں باتونی ہوں۔ اب یہ لمبا خط دیکھ کر بھی یہی خیال کرو گی کہ یہ عادت اب تک نہیں گئی۔ لیکن یہ سوچنے میں کتنی مسرت ہے کہ تم اس خط کو پڑھو گی جو میں اپنے قلم سے لکھ رہا ہوں۔ تم سچ مچ ان الفاظ کو پڑھو گی۔ تمہاری آنکھیں ان الفاظ کو دیکھیں گی۔ اس خط پر تمہارے چہرے کا عکس پڑے گا۔

کیا میں تم سے ملنے اسٹیشن پر آؤں؟ کیا مُجھے آنا چاہیے؟ اپنے اجنبی سے چہرے اور اس مسلے ہوئے پژمردہ دِل کو ساتھ لے کر۔ کیا ان بہکی نگاہوں سے تمھیں

دیکھوں؟ یہ آنکھیں اب اس قابل نہیں رہیں۔ یہ ہونٹ ملوث ہو چکے ہیں۔ یہ پیشانی جس پر تمہارے لبوں کا مقدس نشان تھا، اب چھوٹی ہو چکی ہے اور یہ سر جو کبھی بہت مغرور تھا کئی آستانوں پر جھک چکا ہے۔ اب میری باتیں بھی بالکل معمولی سی ہیں۔ تم مُجھے دیکھ کر سہم جاؤ گی، کہیں مجھ سے نفرت نہ کرنے لگو۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بے چین رہوں لیکن تمہارے سامنے نہ آؤں۔ مگر مُجھے اپنی قوتِ ارادی پر اعتبار نہیں ہے اس لیے کل ہی یہاں سے کہیں باہر چلا جاؤں گا اور اس وقت واپس آؤں گا جب تم یہاں سے گزر چکی ہو گی۔ اگر یہاں رہا تو نہ جانے کون سا جذبہ مُجھے کھینچ کر تمہارے سامنے لا کھڑا کرے۔ اور اگر یوں ہو گیا تو زندگی محال ہو جائے گی۔ میں کل ہی کہیں دور چلا جاؤں گا۔

سمجھ لو کہ وہ روح مر چکی ہے جو تم پر نثار تھی، جس کی معصومیت اور جس کا خلوص تمہیں پسند تھا۔ اس نے اپنی مختصر سی حیات میں فقط تم سے محبّت کی ہے۔ اور اب میں ایک بے جان جسم لیے پھرتا ہوں جو بالکل اجنبی ہے، جسے میں نہیں پہچانتا۔

خط اب یہیں ختم کر دینا چاہیے۔ میں نے ایک طویل اور بے ربط خط لکھا ہے۔ اس کی وجہ میرے بے ربط خیالات ہیں اور خط بالکل بے معنی ہے۔ جو دماغ میں آتا گیا، لکھتا چلا گیا۔

لیکن آخر میں یہ ضرور بتاؤں گا کہ دنیا میں اس وقت اگر کوئی چیز سب سے بڑی مسرّت عطا کر سکتی ہے تو وہ تمہاری دید ہے۔ تمہیں دیکھنے کے لیے میں کس قدر بیقرار ہوں۔ اگر آج میں وہی پہلا سا بھولا بھالا لڑکا ہوتا جس کے دِل میں تم ہی تم ہوتیں، جس کے چہرے پر معصومیت کی ذرا سی بھی جھلک ہوتی تو مجھ سا مسرور دنیا میں اور کوئی نہ ہوتا۔

میں سیاہ شیروانی پہن کر تم سے ملنے آج اپنے ماتھے پر بال پریشان کر کے۔ تم سے طرح طرح کے گلے کرتا۔ بے رُخی اور جدائی کے شکوے ہوتے۔ اور تمہیں ایک بار جی بھر کے دیکھ کر اپنے دِل کو نور اور نئی جلا سے بھر لیا۔

اس خط کو پھر طول دیتا جا رہا ہوں۔

خُدا حافظ۔

محبّت

میں نے اپنا سامان ویٹنگ روم میں رکھوا دیا خود پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ میری ٹرین کو علی الصبح آنا تھا اور اس وقت رات کے صرف نو بجے تھے۔ کافی سردی تھی اور کوٹ لینے اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کمار اور بشیر اندر بیٹھے ہیں۔

”ارے تم کہاں؟“

ہم آپس میں مل رہے تھے کہ اتنے میں دروازہ کھلا تو دیکھا کہ لطیف صاحب چلے آرہے ہیں۔ ”نالائقو! تم تینوں یہاں کیسے؟“

کتنا عجیب اتفاق تھا۔ ہم چاروں دوست ایک دوسرے سے دُور دُور رہنے کے باوجود چند مہینوں کے بعد کہیں نہ کہیں کُچھ دیر کے لیے اکٹھے ضرور ہو جاتے تھے۔ اکثر کسی اسٹیشن پر ملاقات ہوتی تھی۔

ہم چاروں کی گاڑیاں مختلف تھیں، ہم مختلف سمتوں میں جا رہے تھے لیکن یہ بات ہمیں ان کمروں میں بسر کرنی تھی۔

اب جو باتیں شروع ہوئیں تو کھانے کا بھی ہوش نہ رہا۔ کھانا کھا کر انگیٹھی کے سامنے بیٹھ گئے اور کافی کا دور چلنے لگا۔ ہم چھ ماہ کے بعد ملے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ موضوع وہی تھا جو تقریباً سب نوجوانوں کا محبوب موضوع ہوا کرتا ہے ____ یعنی محبّت۔ آخر طے ہوا کہ ہر ایک ان چھ مہینوں کا سب سے رنگین واقعہ سنائے۔

پہلے کمار کی باری تھی۔ ایک سال پہلے کمار کہیں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے لڑکی کو دیکھا تھا، نہایت حسین تھی۔ پھر ہم نے سُنا کہ اس کی شادی نہیں ہو رہی۔ لڑکی نے انکار کر دیا یا خُدا جانے کیا ہوا۔

بشیر بولا۔ ”کمار سے کیا پوچھتے ہو مجھ سے پوچھو۔ میں اس کی کہانی سناتا ہوں۔ جب سے پُشپا نے انکار کیا ہے، یہ دن بدن ہرجائی ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تو اس کی پارسائی اور معصومیت کا دُور دُور چرچا تھا اور کیا اب یہ ہر جگہ پھسل جاتا ہے، ہر ایک کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگتا ہے۔ جن دنوں پُشپا اسے اُلّو بنا رہی تھی ان ہی دنوں ایک لڑکی موہنی بھی اسے چاہتی تھی لیکن موہنی اور پُشپا میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جتنی پُشپا حسین تھی اتنی ہی موہنی بخشی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں موہنی میں کوئی جاذبیت نہیں۔ اور یہ پچھلے چار مہینوں سے موہنی کا دیوانہ ہے۔ دو دو تین تین روز کی چھٹی لے کر، بہانے کر کر کے کسی نہ کسی طرح اس کے پاس

جا پہنچتا ہے۔ اسے طرح طرح کے تحفے بھیجتا ہے۔ ہر روز خط لکھتا ہے۔ حالانکہ اس لڑکی سے تو یہ خود کہیں خوبصورت ہے، لیکن نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔"

"کیوں بھئی کمار ______" میں نے شکایتاً پوچھا۔

کمار بولا۔ "سچ پوچھو تو اس محبّت و حبّت سے بالکل عقیدہ اُٹھ گیا ہے۔ میرے خیال میں ہم کسی خاص لڑکی سے محبّت نہیں کرتے، بس لڑکی سے محبّت کرتے ہیں، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ زندگی میں جو لڑکی سب سے پہلے ملتی ہے اسی پر مر مٹتے ہیں اور اسے یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے فقط اسی کا انتظار رہا ہے۔ حالانکہ اس لڑکی کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تب بھی ہم بالکل وہی باتیں اس سے کہنے بیٹھ جاتے۔ میں نے موہنی سے بالکل وہی باتیں کی ہیں جو کبھی پُشپا سے کی تھیں۔ ویسے ہی تحفے اسے دیئے ہیں۔ وہی ناز برداریاں کی ہیں۔ اور مُجھے ذرا سا بھی افسوس نہیں۔ چند روز ہوئے میں نے پُشپا کو دیکھا تھا۔ اب مُجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔ وہ اس قدر بُری معلوم ہوئی کہ میں وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اب مُجھے محبّت سے بھی نفرت ہے۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے، اس میں حقیقت نام تک کو نہیں۔ اور ہاں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ تمہارا کیا ہوا؟"

"میں ابھی تک منتظر ہوں۔" میں نے کہا۔

"کس چیز کے منتظر ہو؟ اس کے اشارے کے، یا اس کی توجّہ کے؟"

"یہ تو معلوم نہیں، لیکن میں منتظر ضرور ہوں۔ اور منتظر رہوں گا۔"

"شاباش! اگر تم جیسے چند اور عاشق اکٹھے ہو جائیں تو ایک نئی الف لیلہ تیار ہو سکتی ہے!" کمار بولا۔

کُچھ دیر کی نوک جھونک کے بعد بشیر اپنا قصّہ سنانے لگا۔ "یہ دہلی کا ذکر ہے۔ اسٹیشن پر جب شام کو گاڑی رُکی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسی وقت ایک مختلف سمت سے ٹرین آئی تھی اور عین سامنے ایک بیحد حسین چہرہ کھڑکی میں دکھائی دیا۔ اسے فقط چند لمحوں کے لیے دیکھ سکا۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا۔ مُجھے آگے جانا تھا۔ اگلی ٹرین میں جگہ نہ مل سکی اور رات کو اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑا۔ میں وٹینگ روم میں پہنچا۔ جو دیکھتا ہوں تو وہی چہرہ سامنے ہے جسے ابھی ابھی ریل میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے ابّا، امّی اور تین چار بہن بھائی تھے۔ وہ مُجھے دیکھ رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ میز پر رکھے ہوئے سوٹ کیس کی آڑ لے کر مُجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک اخبار اٹھالیا اور اس کی اوٹ میں ہو کر بیوقوفوں کی طرح اسے تکنے لگا۔ ہم دونوں کتنی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ اتنی دیر شاید نہ میری آنکھ جھپکی اور نہ اس کی۔ وہ نہایت حسین تھی۔ اس کے چہرے پر حسن کے علاوہ

معصومیت بھی تھی اور تمکنت بھی۔ ایسی حسین لڑکی میں نے مدّت سے نہیں دیکھی تھی۔ پہلے خیال آیا کہ شہر میں عزیزوں سے مل آؤں لیکن اب وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

مجھ پر نشہ طاری ہو گیا۔ ایسا سرور کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ کیا کسی طرح اس سے باتیں بھی ہو سکتی ہیں؟ ایسی لڑکی کی باتیں کس قدر پیاری ہوں گی؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے ابّا اور امّی جو ساتھ ہیں۔ اگر آج اس سے باتیں نہ کر سکا اور کل ہم جدا ہو گئے تو عمر بھر اس کا پچھتاوا رہے گا۔ کیا مُجھے کوئی موقع نہ مل سکے گا؟ میری پیشانی جلنے لگی۔ آنکھوں کے سامنے آتشیں تتلیاں ناچنے لگیں۔ جیسے کسی نے مُجھے شعلوں میں دھکیل دیا ہو۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ آج اس سے ضرور ملوں کا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔

وہ سب ڈائننگ روم میں کھانا کھانے چلے گئے۔ میں ذرا سے وقفے کے بعد گیا لیکن وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ اس کے قریب نہ بیٹھ سکا۔ جب واپس آیا تو دیکھا کہ وہ سب پکچر جانے کی تیاری کر رہے ہیں، کسی سینما میں سیکنڈ شو دیکھنے جا رہے تھے۔ وہ بھی تیار معلوم ہوتی تھی۔ میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھوں آنکھوں میں التجائیں کرنے لگا۔ میری نگاہیں اس سے کہہ رہی تھیں۔ کاش تم یہاں ٹھہر

جاتیں۔ کاش تم ان کے ساتھ نہ جاتیں، پھر ہم نزدیک بیٹھ کر ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھتے۔

دفعتاً اس نے اپنی امّی سے کُچھ کہا۔ وہ معذرت کر رہی تھی۔ میرے سر میں شدید درد ہے۔ مُجھے وہاں ذرا لطف نہ آئے گا بلکہ آپ سب کو ناحق پریشان کروں گی۔ پہلے تو وہ نہ مانے۔ اس کے ابّا اسے مجبور کرتے رہے لیکن وہ مصر رہی۔ میں باہر آ گیا۔ شاید اس وقت میری موجودگی انہیں ناگوار محسوس ہو رہی ہو۔ بے قراری اور انتظار کے عالم میں باہر نکلنے لگا۔ حتیٰ کہ میں نے انہیں باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے ابّا، امّی، دو بچیاں، ایک چھوٹا لڑکا۔ بس! تو گویا وہ نہیں جا رہی۔ میرا دِل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ ہونٹ سوکھ گئے۔ اب میں بارگاہِ حسن میں کیا نذرانہ لے کر جاؤں؟ اس حسین شعلے کے نزدیک کیونکر جاؤں؟ جھجک تھی، ڈر تھا، رعب طاری تھا۔ جب اندر گیا تو وہ میری منتظر تھی۔ ہم دونوں مُسکرائے۔ وہ بدستور مُجھے دیکھ رہی تھی، لیکن اب نگاہوں میں اجنبیت بالکل نہیں تھی۔ ہم دونوں وہاں اکیلے تھے۔ باہر مسافر قلی اور بیرے بھاگتے پھر رہے تھے، ان کا شور مخل ہوتا تھا۔

”چلیے باہر چلیں۔“

”کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں! میں اسے بر آمدے میں لے گیا۔" وہ دیکھئے سڑک کے اس پار باغ ہے، وہاں!"

"اور جو ابّا آ گئے تو؟" اس نے پوچھا۔

"ابّا بارہ بجے سے پہلے نہیں آسکتے اور ہم اس سے پہلے واپس پہنچ جائیں گے۔"

اس نے کُچھ اس انداز سے مُجھے دیکھا کہ وہ نگاہیں دِل کو چیرتی ہوئی چلی گئیں۔ ذرا سی دیر میں ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ سڑک کو عبور کر کے باغ میں پہنچے۔ اگرچہ وہاں روشنی تھی، لیکن شور کم تھا۔ آخر ہمیں ایک تنہا سا گوشہ مل گیا۔ ہم نے وہاں دو گھنٹے گزارے۔ خوب باتیں ہوئیں۔ بار بار ایک دوسرے سے محبّت کا اظہار کیا۔ اپنی بے انتہا محبّت کا یقین دلایا۔ اس قدر دِل آویز لمحے زندگی میں پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ قسمت اتنی مہربان کبھی نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ اپنے حالات سے مایوس تھی یا اس نے کوئی چوٹ کھائی تھی۔ یا اسے میں بے حد پسند آ گیا۔ یا ماحول ہی کُچھ ایسا تھا۔ سفر میں ایک مختصر سا قیام اور ایک عجیب ملاقات، تنہا گوشہ میں نگاہوں کے پیغام اور پھر نو عمری۔ جب ہم دونوں پودوں میں گھرے ہوئے تھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اس سے دیوانہ وار محبّت کرتا ہوں اس کے بغیر اب ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ادھر وہ بھی مُجھے ایک ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایسی کھوئی ہوئی

نظروں سے جیسے وہ سب کُچھ ہار بیٹھی ہے۔ اچانک وقت کا خیال آ گیا اور ہم فوراً لوٹ آئے۔ میں اسے چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے ابّا اور امّی وغیرہ آ گئے۔ میں نے کُچھ دیر انتظار کیا۔ پھر اندر چلا گیا۔ کُچھ دیر بعد سامان کی فکر پڑی، گاڑی کی آمد، اپنی نشست کا خیال۔ کُچھ ایسی گڑبڑ مچی کہ اسے دیکھ نہ سکا۔ جب ٹرین میں بیٹھا روانگی کا منتظر تھا تو نگاہیں سامنے کھڑی ہوئی ٹرین کی طرف چلی گئیں اور ایک کھڑکی پر جم کر رہ گئیں۔ وہی چہرہ مُجھے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ہم جدا ہو گئے۔ دفعتہً ایک ایسا خیال آیا جس نے غمگین کر دیا۔ میں نے اس کا پتہ بھی نہ پوچھا۔ افوہ کتنی بھول ہوئی۔ اپنے متعلق بھی تو اسے کُچھ نہ بتایا۔ لیکن بتانے سے کیا فائدہ ہوتا۔ شاید اب کبھی ایسا اتفاق پیش نہ آئے اور ہم مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے پھر کبھی نہ گزریں۔ جب شام کو میں ٹرین سے اُترا تو سب کُچھ بھولتا جا رہا تھا۔ رات کے واقعات دُھندلے پڑتے جا رہے تھے۔ جو کُچھ گزرا تھا اس کی حقیقت پر شبہ ہونے لگا اور اگلے روز یہ یقین ہو گیا کہ میں نے جیسے خواب دیکھا ہو۔ اس کے بعد وہ لڑکی یاد نہیں آئی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھے تھے تو میں نے قسمیں کھائی تھیں کہ اس سے محبّت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ وعدے کیے تھے کہ اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

اور اس کا پتہ تک نہیں پوچھا۔ شاید اس عمر کی محبّت ایسی ہی ہوتی ہے۔ پانی کے بلبلے کی طرح ناپائیدار۔ بالکل سراب کی طرح!"

کمار نے سگریٹ کا کش لگایا اور بولا۔ "ماں، بیٹے اور بھائی بہن کی محبّت کو چھوڑ کر مرد صرف مرد سے محبّت کر سکتا ہے اور عورت عورت سے۔ لیکن مرد اور عورت کی محبّت بالکل ناپائیدار ہے۔ بالکل وقتی چیز ہے۔ جس کی بنیاد چند کمزور جذبوں پر ہو، اس میں استقلال کہاں سے آ سکتا ہے۔ ایسی ہی محبّت لطیف کو بھی تو تھی۔"

"ارے ہاں یار۔" بشیر بولا۔ "پچھلے مہینے میں نے انور کو دیکھا!"

"ویسی ہی ہے، شاید پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ لطیف بے چارے نے تو اسے ایک عرصے سے نہیں دیکھا۔ کیوں لطیف؟"

"ہاں ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔ لیکن اب مُجھے دیکھنے کی پروا بھی نہیں۔"

"شاباش اب بنے ہو انسان۔" کمار بولا۔ "ورنہ وہ دن بھی تو تھے جب جناب امتحان میں پیچھے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ انور کسی تقریب میں آئی ہے۔ کوئی یوں ہی جھوٹ موٹ کہہ دے کہ ہم نے انور کو فلاں جگہ دیکھا ہے، بس لطیف صاحب کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے۔

سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی، کب دیکھا تھا، ساتھ کون کون تھا؟ کیا لباس پہن رکھا تھا؟ کیسی دکھائی دے رہی تھی؟ گلے میں وہ ہار بھی پہن رکھا تھا یا نہیں؟ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں کوئی انگوٹھی تو نہیں پہن رکھی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔"

"تب اور بات تھی!" لطیف بولا۔ "تب لڑکپن تھا، اب تجربوں نے بہت کُچھ سکھا دیا ہے۔ وہی بے وقوف اور پگلا سادِل جو کبھی بے حد حساس تھا اب سمجھدار ہوتا جارہا ہے۔"

"اب تک یہی سنتے آئے ہیں۔" کمار کہنے لگا۔ "کہ محبّت ایک طویل رفاقت کے بعد پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ کر۔ ایک دوسرے کی خوبیاں اور کمزوریاں پہچان کر۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھ چکنے کے بعد محبّت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یار لطیف تمہیں کس قسم کی محبّت تھی؟ کیا تم نے آج تک کبھی انور سے گفتگو کی؟"

"نہیں تو! اگر اتفاق سے فون پر یہ کبھی بول پڑی تو پتہ نہیں۔ ویسے میں نے کبھی اس سے باتیں نہیں کیں۔"

"کبھی اس نے کوئی اشارہ کیا جس سے تمہیں یقین ہوا ہو کہ اسے تمہارا خیال ہے؟"

"نہیں! یہ دوسری بات ہے کہ مُجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ورنہ اس نے آج تک مُجھے پسند نہیں کیا۔ شاید اسے میں برا لگتا تھا۔"

"پھر تمہیں اس سے محبّت کیوں تھی؟ میں نے سنا تھا کہ ان کے گھر میں تمہارا آنا جانا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ جب تم فون کرتے تو تمہاری آواز سُن کر فون بند کر دیا جاتا تھا۔ اس گھر میں بچّوں سے بزرگ تک سب تم سے بے رُخی برتتے۔ پھر تمہیں اس سے کیوں محبّت تھی؟"

"معلوم نہیں۔ میں بتا نہیں سکتا۔ پہلے پہلے اپنے پگلے پن پر اکثر پشیمان ہوا کرتا تھا لیکن اب مُجھے کسی کی پروا نہیں۔ اب سب کُچھ بھلا دیا ہے اب میں کسی انور کو نہیں پہچانتا۔"

"اور تم اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"ہاں! کُچھ دنوں یہ خبط بھی مجھ پر سوار ہو چکا ہے۔"

"تمہیں وہ گھرانا پسند تھا؟ صاف صاف بتانا!!"

"نہیں!"

"تمہیں اس کے ابّا اچھے لگتے تھے کیا؟"

"ہرگز نہیں! مُجھے اس کے ابّا سے سخت نفرت تھی۔ وہ بیحد باتونی ہیں۔ اور پھر وہ چڑچڑے کس قدر ہیں۔ صبح سے شام تک بس باتیں ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ فلاسفی پر گفتگو ہوتی۔ میں نے فلاسفی کا ایم اے کیا ہے اور انہیں اس کے متعلق ایک حرف بھی معلوم نہیں۔ پھر بھی وہ زبردستی مُجھے ہرا دیتے تھے۔ مُجھے ان کی کوئی بات پسند نہیں تھی۔"

"اور انور کے بھائی؟"

"انور کے دونوں بھائیوں سے مُجھے نفرت تھی۔ دونوں پہلے درجے کے بیوقوف ہیں۔ بعض اوقات تو میں انہیں پاگل سمجھتا۔ کہہ تو رہا ہوں کہ اس کُنبے میں سوائے انور کے سب سے نفرت تھی۔ مُجھے اس کوٹھی سے نفرت تھی۔ اس باغیچے سے نفرت تھی۔ آسمان کے اس حصّے سے نفرت تھی جو اس کوٹھی کے عین اوپر تھا۔ وہ سارا کُنبہ بے حد مغرور اور فضول سا تھا۔"

"تم جیسا خوددار لڑکا ان دونوں کالج میں نہیں تھا۔ تم نے یہ مصیبت مول لے کر اپنی خودداری کھوئی، بدنام ہوئے۔ اتنے پریشان رہے۔ غرضیکہ اپنی اس عجیب و

غریب محبّت میں تمہیں نقصان ہی نقصان اٹھانا پڑا۔ اب چونکہ تم نے اپنی رائے بتا دی ہے اس لیے میں اپنے خیالات ظاہر کرنے سے نہیں جھجکتا۔ مُجھے وہ گھرانہ نہ کبھی پسند تھا اور نہ ہے۔ اور انور اتنی اچھی نہیں جتنی تم سمجھتے رہے ہو۔ چونکہ تم نے اسے دُور سے دیکھا ہے اس لیے تمہیں اس کی خامیوں کا علم نہیں۔ میری بہن انور کی سہیلی ہے، وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ تم غالباً اس کے رنگ پر مر مٹتے تھے۔ اور یہ گلابی یا سنہرا رنگ بالکل عارضی چیز ہے۔ شاید تم نے اس کی تنگ پیشانی نہیں دیکھی۔ اس کے غیر نستعلیق ہونٹ نہیں دیکھے۔ اسے چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تم نے یہ محسوس کیا کہ وہی انور ساڑی پہن کر کتنی معمول سی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اسے رنگین دوپٹوں اور شوخ قمیصوں میں دیکھا ہے۔ اس کی شکل کے علاوہ تمہیں اور کوئی باپ نہیں تھا۔ تمہیں اس کا کُنبہ ناپسند تھا۔ پھر تم نے اس سے کبھی بات تک نہیں کی اور وہ تمہیں پسند بھی نہیں کرتی تھی۔ یہ سب کُچھ جانتے ہوئے تمہیں اس سے کیوں محبّت تھی؟"

"بھئی حماقتیں ہر کوئی کرتا ہے!" لطیف بولا۔ "جو کُچھ ہونا تھا ہو چکا۔ میں کبھی کا سنبھل چکا ہوں۔ اب ایسی کوئی کمزوری میرے دِل میں نہیں رہی۔ جب وہاں سے روانہ ہوا تو دِل ہی میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں نے انور کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کاش میں اسے کبھی نہ دیتا۔ لیکن اب یہ سب بے معنی ہے۔ اب مُجھے نہ کسی انور کی پرواہے نہ میرے سینے میں کمزور سا دِل ہے۔ پچھلی مرتبہ جب

میں لاہور سے گزرا تو بغیر وہاں اُترے سیدھا نکل گیا۔ یہ تو آج تم نے یاد دلایا ورنہ میں تو اس قصّے کو کبھی کا بھول چکا تھا۔ اب مجھ میں وہ خودداری واپس آگئی ہے، اب میں وہی پرانا لطیف ہوں۔"

"افوہ! بارہ بج چکے ہیں۔ صبح چار بجے اٹھنا ہے۔" بشیر بولا۔ "میں اور کمار تو سوتے ہیں، کمار کی گاڑی ساڑھے چار بجے آتی ہے۔"

"بہت اچھا! لیکن صبح ہمیں ضرور جگا دینا۔ ہمیں چپ چاپ ہی دفع ہو جاؤ۔"

"تم بے فکر رہو، ہم کان پکڑ کر اٹھالیں گے۔" کمار بولا۔

شب بخیر کہہ کر کمار اور بشیر ساتھ کے کمرے میں سونے چلے گئے۔

میں اور لطیف دونوں انگیٹھی کے سامنے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ کُچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر لطیف نے اپنی کرسی کھینچ کر میرے قریب کر لی اور آہستہ سے میرے کان میں بولا۔ "یہ سب کُچھ درست ہے۔ جتنی باتیں ہوئی ہیں سب صحیح ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود مجھ میں کمزوری اب تک ہے۔ اس سینے میں اب کوئی کمزور یا ڈرپوک دِل نہیں دھڑکتا، اب اس میں ایک نڈر اور بے پروا دِل ہے۔ ٹھوکروں اور تجربوں نے مُجھے بہت کُچھ سکھا دیا ہے۔ اب مُجھے اپنے خیالات پر قابو ہے، اپنے دماغ پر قابو ہے۔ لیکن اگر آج انور مجھ پر مہربان ہو

جائے تو اس کے قدموں میں جھک جاؤں۔ اگر آج وہ مُجھے کوئی حکم دے دے تو اس کی تعمیل کے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں۔ اس کے ہونٹوں سے میرے لیے ایک پیار بھرا بول نکل جائے تو میں پل بھر میں ویسا ہی خبطی اور بے وقوف بن جاؤں گا۔ اگر وہ ذرا سا بھی پیام بھیج دے یا ایک خط ہی لکھ دے تو میں سب کُچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں جا پہنچوں۔ اور انور کے وہی باتونی ابّا، اس کا وہی مغرور کُنبہ، وہ بھیانک کوٹھی۔ وہ سب مُجھے اچھے معلوم ہونے لگیں۔ اور یہ کمزوری ہمیشہ رہے گی۔ اپنا سینہ چیر کر اس دِل کو نوچ کر باہر پھینک سکتا ہوں لیکن دِل سے اس کمزوری کو نہیں نکال سکتا۔ کُچھ ایسی ہی عجیب چیز ہے یہ کمبخت محبّت۔“

اور ہماری نگاہیں انگیٹھی پر جمی ہوئی تھیں جہاں لپکتے ہوئے شعلوں کی جگہ اب راکھ اور چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں، لیکن تپش بدستور تھی۔

تحفے

میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اتنے سارے آدمی کہاں سے آ گئے۔ کوئی ایسا بڑا میچ بھی نہیں تھا۔ بس اتوار کا دن تھا۔ غالباً سارے شہر میں کرکٹ کا میچ صرف ہم لوگ ہی کھیل رہے تھے۔ یہ ہر سال کلب کے وسیع میدان میں ہوتا اور تین روز تک کھیلا جاتا۔ چاروں طرف بے شمار آدمی کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان آدمیوں کے پیچھے بھی آدمی ہی تھے اور ان کے پیچھے بھی آدمی۔ غرضیکہ لاتعداد ہجوم جمع تھا۔

میچ کا تیسرا دن تھا۔ مخالف ٹیم آخری اننگ کھیل رہی تھی۔ سکور یہ تھا کہ سب کچھ ملا کر انہیں جیتنے کے لیے صرف چالیس رنز درکار تھیں۔ ان کے پانچ کھلاڑی باقی تھے اور ابھی کھیل ختم ہونے میں کافی دیر تھی۔ ایک صاحب پچھتّر رنز بنا چکے تھے اور ہمارے بولرز کی خوب مرمت کر رہے تھے۔ غالباً اپنی سنچری مکمل کرنے کی فکر میں تھے۔ میں باؤنڈری لائن پر کھڑا کلب کے ممبروں سے باتیں کر رہا تھا۔ کوئی گیند اتفاق سے آ گئی تو اٹھا دی اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

کلب کے سب ممبر موجود تھے۔ اس لیے کہ ایک تو ہمارے گراؤنڈ میں میچ ہو رہا تھا، دوسرے یہ کہ کلب کے دو ممبر بھی مقامی ٹیم کی طرف سے کھیل رہے تھے۔ ایک میں اور ایک "ف" صاحب۔ ہم دونوں کو خوش فہمی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب مُجھے دیکھنے آئے ہیں۔ ادھر وہ خوش تھے کہ ان کا کھیل دیکھ دیکھ کر لوگوں کا بُرا حال ہے۔ غلط فہمی کی اصل وجہ لڑکیاں تھیں جو کافی تعداد میں موجود تھیں، لیکن "ف" صاحب نہ جانے لڑکیوں کو دیکھ کر کیوں خوش ہو رہے تھے کیوں ان کی اپنی لڑکیاں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔

خیمے کے پیچھے بڑی رونق تھی۔ "ع" کی سفید فریم کی سیاہ عینک دور سے نظر آ رہی تھی۔ "ب" اپنی چمپئی اوڑھنی کو بار بار سر سے اُتار رہی تھیں۔ پھر یکایک اوڑھنی ان کے سر پر نہ جانے کیونکر جا پہنچی۔ "ن" ضرورت سے زیادہ مُسکرا رہی تھیں۔ "ن" کرسی چھوڑ کر میز پر محض اس لیے بیٹھی ہوئی تھیں کہ سارا ہجوم ان کے کٹے ہوئے بالوں کے درشن کر لے۔ اور "ط" صاحبہ کے دِل میں نہ جانے رہ رہ کر کیا ولولہ اٹھتا وہ اچھل کر بلاوجہ کھلاڑیوں کی تعریفیں کر رہی تھیں۔

مسٹر اور مسز حسن بالکل میرے قریب بیٹھے تھے۔ حسن کبھی کبھی میری طرف ٹافی پھینکتے جسے میں بڑے اچھے سٹائل سے کیچ کرتا۔ کھیل میں میرا ذرا دھیان نہیں تھا، کیونکہ میچ شروع ہوتے ہی کپتان سے میری ان بن ہو گئی۔ میں فاسٹ

بولر تھا اور ہمیشہ شروع شروع میں بولنگ کیا کرتا۔ کپتان نے نہ جانے کس مسخرے سے بولنگ شروع کرائی جس کی خوب مرمّت ہوئی۔ جب گیند کی چمک اُڑ گئی تب کپتان نے گیند میری طرف پھینکی۔ میں نے چند اوور پھینکے۔ جب کُچھ نہ ہوا تو کپتان صاحب ناراض ہو گئے کہ میں جان بوجھ کر بے دِلی سے گیند پھینک رہا ہوں۔ آخر مجھ سے گیند لے لی گئی اور دوسری اننگ میں مُجھے بالکل نہ پوچھا گیا۔ کلب کے ممبر بار بار مجھ سے کہتے تھے کہ کُچھ کر کے دکھاؤ۔ میں نے بہانہ کر رکھا تھا کہ بازو میں موچ آگئی ہے۔

"ع" نے چاکلیٹ کا ٹکڑا میری طرف پھینکا جسے میں نے لپک کر کیچ کر لیا اور تالیاں بجیں۔ ہمارے کپتان صاحب جل کر کوئلہ ہو گئے ہوں گے۔ وہ میری طرف دیکھ تو رہے تھے لیکن مجھ سے اس قدر بیزار ہو چکے تھے کہ کُچھ نہیں کہا۔

"ارے" یہ "ن" کے ساتھ کون بیٹھا ہے؟ خوب ہے! کیا شان ہے! چہرہ کیسا دمک رہا ہے اور آنکھیں کتنی نشیلی ہیں۔ غالباً یہ کلب میں پہلی مرتبہ آئی ہیں۔ ویسے ان سب لڑکیوں سے حسین ہیں۔ اور یہ غل۔ لینا پکڑنا۔ یہ کیا مصیبت آئی۔ میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا؟ کیا لینا؟ کیا چیز ہے؟۔ کیا کہہ رہے ہیں یہ سب؟ لوگ چلا چلا کر مجھ سے کہہ رہے تھے۔ لینا شاباش پکڑنا۔ میں بوکھلا گیا۔ بات کیا ہے؟ ہجوم چلا رہا تھا۔ شاباش باؤنڈری پر پکڑنا۔ گھبرا کر باؤنڈری لائن

کے ساتھ ساتھ بھاگا۔ شوں سے ایک گیند قریب سے گزری اور میں نے لپک کر پکڑ لی۔ کافی اچھلنا پڑا لیکن ہوا ہی میں اسے دبوچ لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آخر یہ گیند کس نے پھینکی تھی۔ ایک کھلاڑی بلّا سنبھالے واپس جا رہا تھا۔ افوہ! یہ تو آؤٹ ہو گیا۔ کس نے آؤٹ کیا اسے؟ اور یہ ہوا میں اُڑتی ہوئی گیند. لا حول ولا قوۃ! تو گویا میں نے کیچ کیا تھا۔ یک لخت معلوم ہوا کہ میں نے کمال کر دیا اور ایک نہایت ہی مشکل کیچ کیا ہے۔ کپتان نے بھی تعریف کی۔ میں نے بورڈ کی طرف دیکھا۔ جیتنے کے لیے انہیں صرف دس رنز درکار تھیں۔ اور ابھی ان کے چار کھلاڑی باقی تھے۔ ایک لمبے قد کے حضرت بلّا لیے وکٹوں کی طرف جا رہے تھے۔ دوسری طرف وہ بیٹسمین کھڑا تھا جس کا سکور اب پچاسی تھا۔ بولر نے گیند پھینکی اور نئے کھلاڑی نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور وہ ہٹ لگائی کہ گیند درختوں کے اوپر سے گزر گئی۔ نہایت شاندار چھکا لگا۔ غضب خُدا کا فقط چار رنز باقی رہ گئیں۔

اوور ختم ہوا۔ دفعتہً کسی نے میرا نام پکارا۔ چونک کر دیکھا تو کپتان بلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گیند تھی۔ اس نے پھر ایک نعرہ لگایا اور اشارہ کیا۔ میں حیران ہو کر وکٹوں کی طرف چل دیا۔ ہجوم سے مختلف قسم کی آوازیں آئیں۔ مسٹر اور مسز حسن نے تالیاں بجائیں۔ دو تین سیٹیاں بھی سنائی دیں۔ کسی نے چلا کر کہا۔ ”شاباش! ذرا ہو جائیں دو دو ہاتھ۔“

کپتان نے گیند میرے ہاتھ میں دے دی۔ سکور کے مطابق انہیں جیتنے کے لیے چار رنز اور برابر رہنے کے لیے تین رنز درکار تھیں اور ابھی چار کھلاڑی باقی تھے۔ میں نے دِل میں سوچا کہ اب ایک چوکا لگے گا اور میچ ختم۔ سامنے وہ مولانا بلّا لیے کھڑے تھے جن کا سکور پچاسی تھا۔ بھلا یہ کہیں بخشیں گے۔ میں نے فیلڈ جمائی اور ٹھنڈے پانی کے گلاس کی درخواست کی جو ہمارے کپتان نے نامنظور کر دی۔ عجب تماشا ہے۔ اب ہارتے وقت مُجھے بلانے کا مطلب؟ سوچا ہو گا کہ چلو اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ میں نے قدم گنے اور ہجوم کی طرف دیکھا۔ اب یہاں یہ عرض کر دینا میرا فرض ہے کہ میں بہت اچھا بولر نہیں ہوں۔ اگر بریڈ مین یا ہیمنڈ کو سامنے کھڑا کر کے ساری عمر بولنگ کرتا رہوں تب بھی انہیں آؤٹ نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی آؤٹ ہو جائیں۔ ہجوم اور شور و غل سے کوئی خاص گھبراہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ گھبراتا تو تب جب جیتنے کی کوئی اُمّید ہوتی۔ یہاں تو معاملہ بالکل چوپٹ تھا۔ ادھر وہ پچاسی رنز والے حضرت سامنے کھڑے مُجھے گھور رہے تھے۔ میں نے بھاگنا شروع کیا۔ بے تحاشا بھاگا۔ وکٹوں کے ادھر سے زبردست چھلانگ لگائی اور پورے زور سے گیند پھینکی۔ انہوں نے ایک نہایت خوبصورت کٹ مارا اور بھاگے۔ ہمارے ایک فیلڈر نے گیند روک لی اور اب وہ نئے صاحب میرے سامنے کھڑے تھے اور جیتنے کے لیے انہیں صرف تین رنز درکار تھیں۔

میں نے دوڑ لگائی۔ اس دفعہ نہایت تیزی سے گیند پھینکی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بڑی پھرتی سے گیند کو کھیلا، لیکن گیند اونچی رہ گئی اور شپ سے سلپ میں پکڑلی گئی۔ میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ صاحب واپس جا رہے تھے۔ اب تین کھلاڑی رہ گئے... اور تین رنز۔ توبہ کرو..... میں نے دِل سے کہا، دھڑکنے وڑکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شکر کرو کہ ایک وکٹ تو ملی، عزّت ہو گئی۔ اب ایک نہایت ہی ہونّق قسم کے کھلاڑی تشریف لائے۔ انہوں نے نہ کوئی نشان لگایا اور نہ کُچھ کیا۔ بس بلّا لے کر اس انداز سے کھڑے ہو گئے جیسے کہہ رہے ہوں کہ ابھی سمجھتا ہوں تجھ سے، ذرا آ تو سہی۔ میں بھاگا۔ وکٹوں کے پاس پہنچ کر یکلخت آہستہ ہو گیا اور ایک یارکر پھینکا۔ ادھر وہ صاحب آگے بڑھے اور یا علی کہہ کر جو بلّا گھمایا ہے تو گیند نیچے سے نکل گئی اور وکٹ اُڑ گئی۔ اس مرتبہ وہ غل مچا کہ کان بہرے ہو گئے۔

اب میں کُچھ گھبرایا۔ دو کھلاڑی باقی ہیں اور جیتنے کے لیے انہیں تین رنز چاہیں۔ انکا آؤٹ ہونا بہت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ پھر بھی کوشش کرو لیکن کوشش کیا خاک کرو، اگر کسی نے فقط ایک چوکا لگا دیا تو معاملہ صاف ہے۔ اور یہ چھپاسی ناٹ آوٹ والے صاحب اس طرف کھڑے دانت پیس رہے ہیں۔ اگلے اوور میں یہ پہلی ہی گیند پر سکور کریں گے۔ خیمے کی طرف دیکھا۔ "ن" کی نیلی

ساڑھی نظر آرہی تھی اور "ب" کی چمپئی اوڑھنی بھی۔ ان نئی خاتون کا چہرہ بری طرح دمک رہا تھا۔ میری کنپٹیاں تمتما گئیں۔ پسینہ آ گیا۔

اور جو کہیں یہ دو وکٹیں بھی۔ پاگل ہوئے ہو، میں نے دِل ہی دِل میں کہا۔ اب ایک موٹے تازے سانڈ تشریف لائے۔ مُجھے اس طرح گھور رہے تھے جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ انہوں نے اپنا بلّا اس ادا سے زمین پر جما دیا جیسے اب اسے کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ میں دو انگلیوں اور انگوٹھے میں گیند لی اور سوچا کہ اس مرتبہ بریک کراتے ہیں، لیکن کہاں کی بریک اور کیسی بریک۔ ایک عجیب فضول سی گیند پھینکی جو دھپ سے اس کے پیٹ کو لگی یا بلّے کو اور وکٹ کیپر کی بائیں طرف سے نکل گئی۔ شارٹ LEG کے فیلڈر نے دوڑ لگا کر اسے روکا اور میری طرف پھینکا لیکن اتنے میں جیسے وہ رسّہ تڑا کر بھاگا۔ ادھر کے بیٹسمین نے نعرہ لگایا کہ واپس جاؤ۔ وہ کُچھ رکا کُچھ نہیں۔ میں نے جلدی سے گیند وکٹ کیپر کی طرف پھینکی کہ وہ رن آؤٹ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ گیند سیدھی وکٹوں میں گئی۔ چاروں طرف سے فلک شگاف اور زمین دوز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ تین کھلاڑی آؤٹ۔ اب آخری کھلاڑی آرہا ہے اور تین رنز باقی ہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ایک پھریری لی۔ اس وقت کُچھ نہیں سوچنا چاہیے۔ خیر! اس مرتبہ بریک ضرور کروں گا۔ میں نے گیند کو توڑ مروڑ کر پھینکا۔ گیند ترچھی گئی۔ راستے ہی میں ایک طرف کو مُڑ گئی اور کھلاڑی کے برابر سے نکل گئی۔

وکٹ کیپر نے روک لی اور میری طرف پھینک دی۔ ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اتنا بڑا مجمع یکلخت خاموش ہو گیا۔ اب یہ اوور کی آخری گیند ہے اور آخری کھلاڑی۔ ''ب'' کی چمپئی اوڑھنی بار بار آنکھوں کے سامنے کود جاتی۔ یہ لڑکیاں کیا کہیں گی۔

میدان تقریباً تقریباً مار ہی لیا تھا۔ اگر اب ہارے تو بڑا افسوس ہو گا۔ شام کو کلب میں کوئی نزدیک بھی نہ پھٹکے گا۔ اچھا چلو اب گیند پھینکو۔ جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگا، پوری طاقت سے گیند پھینکی اور کھلاڑی کی طرف بھاگتا ہی چلا گیا۔ اس نے گیند روکنے کے لیے بلّا آگے کر دیا جیسے آئینہ دکھاتے ہیں۔ گیند بلّے پر پڑی اور ذرا اُچھلی۔ میں نے آنکھیں میچ کر ایک قلانچ بھری۔ اچھلا، گِرا اور گرتے گرتے گیند ہوا میں کیچ کر لی۔ جیسے غدّر مچ گیا، زلزلہ آگیا، کسی نے سارا کوہ ہمالیہ اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ جیسے میں نے قطب صاحب کی لاٹھ سے چھلانگ لگا دی اور راستے ہی میں بیہوش ہو گیا۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں فقط ایک خیال گُدگُدی کر رہا تھا۔ کہ ہم جیت گئے۔

اور جب پوری طرح ہوش آیا تو میں کلب میں تھا اور ''ن'' کے ساتھ کیرم کھیل رہا تھا۔ سامنے صوفے پر ''ب'' اور ''ط'' بیٹھی تھیں۔ اور ''ع'' میرے بلیزر کی جیبوں سے نہ جانے کیا کیا الا بلا نکال رہی تھیں جو ہجوم نے خوش ہو کر جیبوں

میں ڈال دیا تھا۔ مونگ پھلیاں، چاکلیٹ، ریوڑیاں، سگریٹ کی ڈبیاں، ایک کنگھا، ایک سیب، کُچھ ریزگاری، رومال وغیرہ وغیرہ۔

"آپ اس قدر تعریفیں نہ کیا کریں مُجھے سخت غلط فہمی ہو جاتی ہے اور کئی دنوں تک رہتی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کی تعریفیں کون کرتا ہے ہم تو آپ کے کھیل کی تعریفیں کر رہے تھے۔ اس میں تو آپ کی کوئی خوبی نہیں۔ بس یونہی!"

"لاحول ولا قوۃ! آپ پھر جھوٹ موٹ تعریفیں کر رہی ہیں۔ اگر ساتھ ساتھ برائیاں بھی بتا دیا کریں تو بہتر ہو۔ مُجھے احساسِ کمتری ہونے سے تو رہا۔"

"احساسِ کمتری اور آپ کو؟" سب نے کہا۔ "بالکل ناممکن ہے۔ آپ کو جو یہ احساسِ برتری ہو گیا ہے کہ کسی طرح بھی نہیں جا سکتا۔ آپ کی نگاہوں میں اپنے سوا اور کوئی جچتا ہی نہیں۔ کبھی آپ نے کسی اور کے متعلق سوچا؟"

"ع" مُسکرا دیں۔ "اور مُجھے ایسے انسان پسند ہیں جو ہر وقت اپنے متعلق ہی سوچتے رہیں، جنہیں کسی کی پروانہ ہو۔"

عجیب ہیں یہ لڑکیاں۔ ابھی کُچھ کہہ رہی تھیں اور اب کُچھ اور شروع کر دیا ہے۔

"آخر کیوں ہو کسی کی پروا؟" میں بولا "احساسِ برتری کیوں نہ ہو بھلا ہم کسی سے کم ہیں، کسی کو ضرورت ہو تو آئے، تین مرتبہ سلام کرے اور ہمارا دوست بنے۔"

"ارررررے، آ گئے، نا اپنی اصلیت پر۔" "ب" ایک شرارت آمیز تبسم سے بولیں۔ "دیکھ لیا نا، بس یہی باتیں ہمیں پسند نہیں۔ ہمیں تو اعتراف ہے کہ آپ اچھے ہیں لیکن یہ جو بچپنا ہے یہ!"

"افوہ! یہ سفید بال رہا آپ کے سر میں۔" "ع" نے میرے سر میں سے ایک بال کھینچتے ہوئے کہا۔ "توڑ لوں۔"

"جھوٹ۔"

"ایمان سے بالکل سفید ہے۔"

"توڑ لو۔"

"نہیں، اگر توڑ لیا تو اس کی جگہ سات سفید بال اور نکلیں گے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

اور "ع" نے بال کھینچ کر سامنے کر دیا۔ بالکل سفید تھا۔

"اب آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔"

"نہیں۔ دراصل میں خوشبودار تیل سر میں لگاتا ہوں اس لیے یہ سفید ہو گیا۔"

"جی نہیں! عمر کا تقاضا ہے۔"

"آج کیا تاریخ ہے؟۔ تو گویا چند دنوں کے بعد میں تیئس سال کا ہو جاؤں گا اور اگر تیئس سال سے بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے تو بالکل بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

"اگلے ہفتے آپ کی سالگرہ ہے؟ آپ نے بتایا ہی نہیں۔"

"کون سی نئی بات ہے۔ ہر سال آتی ہے۔"

"ہم ایک پارٹی لیں گے آپ سے۔ کلب میں شاندار پارٹی ہو گی۔"

"پارٹی وارٹی کی بات غلط ہے۔ میں پہلے ہی فضول خرچ ہوں۔ بس آپ لوگوں کو سینما لے جاؤں گا۔"

"اُفّوہ! اس قدر سخاوت۔ حاتم طائی کو شرمندہ کرنے کا ارادہ ہے۔"

"اچھا چلیے، پارٹی نہیں، ایک چھوٹا سا پکنک سہی، اتوار کے روز۔ بس!"

"لیکن میں بے حد فضول خرچ۔"

"یہ کیا فضول خرچ فضول خرچ لگا رکھی ہے۔ اچھا نکالیے اپنا بٹوہ کہاں گیا؟ کھویا گیا؟"

بلیزر کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا، بٹوہ نہیں ملا۔

"جی ہاں! شاید کھویا گیا۔ گر گیا ہو گا کہیں۔ آج دوپہر کے وقت تو تھا۔"

"کہاں گرا دیا؟ آپ سب کُچھ بھول جاتے ہیں، سب کُچھ کھو دیتے ہیں۔ کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ آخر ارادہ کیا ہے؟"

"اب کھویا گیا تو کھویا گیا۔ قصّہ ختم ہوا۔" میں نے کہا اور سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"ماشاءاللہ، کیا بے نیازی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ بٹوہ خالی تھا۔"

"اچھا، چلو دے دو ان کا بٹوہ۔" "ع" بولیں۔ اور انہوں نے بائیں طرف مُڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی مُڑ کر دیکھا۔ وہی حسین چہرہ دکھائی دیا جو میچ میں دیکھا تھا۔ یہ کون ہیں؟ اتنی دُور سے اکیلی بیٹھی ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ شاید ان کی نگاہوں ہی کی تمازت ہے جسے میں اتنی دیر سے محسوس کر رہا ہوں۔ وہ مُسکرائیں اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ میں بٹوہ تھا۔ میں نے اُٹھ کر لے لیا اور انگلیاں ان کی انگلیوں سے چھُو گئیں۔

"شکریہ!"

"انہیں میدان میں ملا تھا، زمین پر پڑا ہوا۔" "ع" بولیں۔ "ادھر لائیے میں دیکھتی ہوں۔ یہ تصویر کس کی ہے؟ اچھا چلیے نہیں دیکھتے اسے۔"

میں نے کنکھیوں سے بائیں طرف جھانکا۔ دو نشیلی آنکھیں مُجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں اور میرا چہرہ جلنے لگا۔ آخر نگاہوں میں کیا جادو ہے۔

ایک آواز نے مُجھے چونکا دیا۔ دت صاحب بلا رہے تھے۔

میں نے معذرت کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دت صاحب نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شاباش بچّے، آج تم نے کمال کر دیا!"

"یہ جی آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ ورنہ!"

"ورنہ بندہ تو بالکل نالائق ہے!" "ع" نے آہستہ سے کہا۔

دت صاحب مُجھے دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں شطرنج ہو رہی تھی۔ یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ شطرنج کون کھیل رہا ہے۔ بے شمار لوگ کھیلنے والوں پر جھکے ہوئے تھے۔ مسز دت ایک طرف بیٹھی کُچھ بُن رہی تھیں۔ انہوں نے عینک اُتاری، میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔ "آؤ بچّے! تم ضرور

بھوکے ہو گئیے۔'' یہ مسز دت کا مخصوص فقرہ تھا۔ اس سے اگلا فقرہ ہوتا تھا۔ ''تم کیا کھاؤ گے؟''

''میں ہوا کھاؤں گا۔ قسم کھاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''بڑا شریر لڑکا ہے۔'' انہوں نے بزرگانہ شفقت سے کہا اور ہیڈ بیرے کو اشارہ کیا۔ اس نے وہیں سے آواز دی۔ ''گلبدن۔''

ہیڈ بیرے نے دوسرے بیروں کے نام رکھے ہوئے تھے۔

''گلبدن، شیخ چلی، علی بابا، گینڈا، اودبلاؤ۔''

''آج تو ہم نااُمّید ہو چکے تھے۔'' دت صاحب بولے۔ ''تعجّب ہے کہ کپتان تم جیسے بولر کو بھول ہی گیا تھا۔''

''جی میرے شانے میں موچ آگئی تھی۔ آداب عرض ورما صاحب۔ جی! یہ تو اتّفاق ہو گیا۔ ورنہ کہاں میں اور!''

ورما صاحب ایک تندرست ساسگار منہ میں دبائے ہوئے تھے۔

''بھئی ہم تو یہی کہتے ہیں کہ کلب کی آدھی رونق صرف تمہارے دم سے ہے۔''

''آپ کی عنایت ہے۔ اور یہ شطرنج کون کون کھیل رہا ہے؟''

"مسٹر اور مسز سنگھ۔"

اور میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس جمگھٹ میں شامل ہو گیا۔ مسٹر سنگھ کو مشورے دینے والے بہت تھے۔ رہ رہ کر مسز سنگھ اسی بات کی شکایت کرتی تھیں۔

"گھوڑا چلیے۔ جناب گھوڑا!" کسی نے سنگھ صاحب سے کہا۔

"آپ گدھا چلیے۔" میں نے مسز سنگھ سے کہا۔

"خُدا کے لیے اپنا فیل بچایئے سنگھ صاحب۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"فرشتوں کے لیے اپنا شُتر بچایئے۔" میں نے مسز سنگھ سے کہا۔

مسز سنگھ اب دلیر ہو گئی تھیں۔ ان کا ایک حمایتی انہیں مشورے دے رہا تھا۔

"اور مسز سنگھ اس پیادے کو آپ زیادہ چلایئے، پیدل چلتے چلتے تھک جائے گا۔"

"سنگھ صاحب اپنا رُخ اس طرف لے آیئے۔" کوئی بولا۔

"اور آپ بھی اپنے رُخ کا رُخ بدلیے۔" میں نے مسز سنگھ سے کہا۔

"شہہ بچئیے۔" سنگھ صاحب مسز سنگھ سے بولے۔ "آپ روانہ کیجئے مسز سنگھ۔" میں نے کہا۔ "بادشاہ مرتا ہے تو مر جائے اس کے اوپر بھی تو کوئی ہوتا ہے۔"

"بادشاہ سے اوپر کیا ہوتا ہے صاحب؟" کسی نے پوچھا۔

"یکّہ!!"

میں واپس اس کمرے کی طرف چلا جہاں لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ راستے میں ایک صاحب منہ میں سگار دبائے اپنی جیبیں ٹٹولتے جارہے تھے۔ غالباً دیاسلائی ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے دیاسلائی نکالی اور ان کا سِگار سُلگا دیا۔

"شکریہ!" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیٹھئے!"

میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ انہیں شہر میں آئے صرف ڈیڑھ ہفتہ گزرا تھا۔ کلب میں وہ آج پہلی مرتبہ آئے تھے۔ انہوں نے میچ میں مُجھے کھیلتے دیکھا تھا۔ وہ محکمہ جنگلات کے کوئی افسر تھے، بڑے ہنس مکھ اور زندہ دِل معلوم ہوتے تھے۔

"اور اس سے ملیے۔ یہ میری لڑکی "ص" ہے جس نے اس سال بی اے کیا ہے۔ یہ بھی پہلی مرتبہ کلب میں آئی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ارے! یہ تو وہی نیا چہرہ ہے۔ آج عجیب حادثے ہورہے ہیں۔ آج ہی تعارف بھی ہوگیا۔

"تم یہاں بڑے ہر دلعزیز معلوم ہوتے ہو۔ آج تم خوب کھیلے۔" اور دو نشیلی آنکھیں بدستور دیکھ رہی تھیں۔

"ابھی تک یہاں میرے دوست نہیں بنے۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

میں نے پتہ بتادیا۔

"گویا ہمارے پڑوس میں رہتے ہو۔ تمہارے ساتھ اور کون کون ہیں؟"

"میں تنہا رہتا ہوں۔"

"تنہا رہتے ہو؟ اچھا اکیلے میں ضرور جی اُچاٹ ہو جاتا ہو گا۔ کل سہ پہر ہمارے ساتھ چائے پیو گے؟"

میں ذرا ہچکچایا، لیکن وہ نشیلی آنکھیں کُچھ اس طرح مُجھے دیکھنے لگیں جیسے آنے کو کہہ رہی ہوں۔

"ضرور آؤں گا۔ بہت بہت شکریہ۔ اب مُجھے اجازت دیجیے۔" میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا کیونکہ "ع" اور "ن" پردوں سے جھانک رہی تھیں۔ واپس پہنچا ہی تھا کہ طعنے شروع ہو گئے۔

”تو گویا مس جنگلات سے آج ہی واقفیت بھی ہو گئی۔ چلیے یہ کسر بھی پوری ہوئی۔“

”آپ کے انتخاب کی داد دیتی ہوں۔“

”بیچاری بے حد حسین اور معصوم دکھائی دیتی ہیں۔“

”جی نہیں، یہ بات نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو ان کے ابّا سے ویسے ہی رسمی طور پر تعارف ہو گیا تھا۔“

تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ فقط ”ن“ صاحبہ ذرا پریشان ہو رہی ہیں۔“ ”ع“ نے کہا۔

”اگر میں پریشان ہوں تو میں نے کسی کی تصویر اپنے لاکٹ میں نہیں لگا رکھی۔“ ”ن“ ”ع“ کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”اور میں کسی کے پسندیدہ رنگوں کی ساڑیاں ہرگز نہیں پہنتی۔ نہ مُجھے دو چوٹیاں بنانے کا اس لیے شوق ہے کہ کسی کو دو چوٹیاں پسند ہیں۔“ ”ع“ نے ”ن“ پر چوٹ کی۔

"اور میں ہر وقت اپنے ابّا سے کسی کی باتیں نہیں کرتی رہتی۔ کسی کی سالگرہ کے تحفوں کے لیے بھی اتنی پریشان نہیں ہوں۔" "ن" بولیں۔

"بہر حال میں نے سب سہیلیوں میں یہ مشہور نہیں کر رکھا کہ کسی سے۔"

اب یہ ضرور لڑ پڑیں گی۔ یہ لڑکیاں بھی خوب ہیں۔ ابھی بزرگوں کی طرح نصیحتیں کر رہی ہیں اور ذرا سی دیر میں بچّوں کی طرح ایک دوسرے کا مُنہ نوچنے کے لیے تیار ہیں۔

"وہ ورما صاحب مُجھے بلا رہے ہیں۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "معاف کیجیے۔"

اور راستے میں سچ مچ مسز ورما مل گئیں۔

"آداب عرض! چچی جان۔"

"خبر دار لڑکے جو آئندہ چچی وچی کہا ہے تو۔ کیا میں اتنی عمر رسیدہ ہوں؟ جب بھی تو چچی جان کہتا ہے کئی دنوں تک یہی خیال رہتا ہے کہ میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں۔"

اور مسز ورما خُدا کے فضل سے چھ بچّوں کی ماں تھیں۔

"آپ تو بگڑنے لگیں۔ دیکھئے چچی جان!۔"

"پھر وہی چچی جان۔۔۔"

ہم باتیں کرنے لگے اور انہوں نے بڑی دلچسپ بات سنائی وہ یہ کہ "ع" اور "ن" وغیرہ نے مسز ورما کو رشوت دی تھی کہ وہ مجھ سے علیحدگی میں مل کر یہ دریافت کریں کہ میں کسے پسند کرتا ہوں اور یہ کہ اس سازش کا پتہ ہرگز نہ چلنے پائے۔ مسز ورما یہی ظاہر کریں کہ وہ اپنی طرف سے پوچھ رہی ہیں۔

"تو تم کسے پسند کرتے ہو؟"

"کسی کو بھی نہیں۔"

"جھوٹ مت بولا کرو۔"

"سچ۔"

"کیوں آخر؟"

"ان میں تصنع حد سے زیادہ ہے۔ بات بات پر بنتی ہیں۔ کسی نے بال ترشوا رکھے ہیں. کوئی ہر وقت ناخنوں پر پالش کر رہی ہیں۔ بات بات پر شکریہ، معاف کیجیے، بڑی خوشی ہوئی۔ یہ لوگ مجھ سے کہیں سمارٹ ہیں۔"

"اور یہ جنگلات کی خاتون آئی ہیں؟"

"ان سے ابھی واقفیت نہیں ہوئی۔"

"تو پھر میں ان کو کیا جواب دوں؟ وہ جان کھا جائیں گی۔"

"کہہ دیجیے کہ ذکر ہی نہیں ہوا۔"

"تب وہ تو اور بھی تنگ کریں گی۔ تم کوئی نہ کوئی جواب ضرور دو۔"

"اچھا تو لیجیے جواب۔ یہ رہی پنسل، کسی کاغذ پر لکھتی جایئے۔ "ع" سے کہیے کہ

آپ نے مجھ کو انتخاب کیا

آپ کے انتخاب کے صدقے

اور "ط" سے یہ کہ۔۔۔

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر

کچھ اُمّید جواب میں گزری"

"تو کیا تم نے اس سے کُچھ کہا تھا؟ کوئی سوال کیا تھا؟؟"

"توبہ کیجئے چچی جان، میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔"

"پھر تو نے چچی جان کہا۔" انہوں نے ڈانٹا۔

"اور 'ن' کا میں ادب کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے بڑی ہیں۔ ان سے صرف یہ کہہ دیجیے کہ۔۔۔

دِل ایک مرحوم کو خُدا بخشے

ایک ہی غمگسار تھا نہ رہا"

"اس کا مطلب؟"

"مطلب وہ خود سمجھ جائیں گی۔"

"خاک سمجھ جائیں۔ مُجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"مطلب تو مُجھے بھی معلوم نہیں۔"

"اچھا اگر وہ ناراض ہو گئی تو؟"

"تو ہو جائیں۔"

”توبہ توبہ، کتنا مغرور لڑکا ہے۔ تجھے کوئی پسند بھی ہے۔ اچھا، ان جنگلات والی خاتون سے کیا کہوں؟“

”انہوں نے پوچھا تو نہیں۔“

”تب کیا ہوا۔ میں ویسے ہی کہہ دوں گی۔“

”سچ مچ؟“

”سچ مچ!“

”ایمان سے؟“

”ایمان سے!“

”تو ان سے یہ کہ۔ آپ لکھتی جائیے۔

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ

مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ“

ہال کمرے میں پیانو بجنا شروع ہو گیا۔ غالباً حسن بجا رہے تھے۔ انہیں موسیقی سے لگاؤ تھا۔ تقریباً سارے ساز نہایت اچھی طرح بجا لیتے تھے۔ پیانو ان کا محبوب ساز تھا۔ ہم سب ہال کمرے میں لپکے، جونز ان کے ساتھ وائلن بجا رہے تھے۔ میں دروازے میں سے سُننے لگا کیونکہ ساری لڑکیاں اندر پہنچ چکی تھیں اور میں ان کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں بیرے نے ایک کاغذ لا کر دیا۔ مسز حسن باہر برآمدے میں مُجھے بُلا رہی تھیں۔ حسن صاحب اور ان کی بیگم کی میں بہت عزّت کرتا تھا۔ دونوں بے حد خلیق اور مہربان تھے۔ مُجھے بچّوں کی طرح چاہتے تھے۔ ویسے عمر میں کُچھ اتنے زیادہ بڑے بھی نہیں تھے۔ ان کی شادی کو بمشکل آٹھ دس سال گزرے ہوں گے۔ اس قدر نفیس اور پیارا جوڑا کلب میں نہیں تھا۔ مسز حسن باہر کھڑی تھیں، چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے سلام کیا۔ بولیں: ”کل مُجھے کسی وقت مل سکتے ہو؟ ایک ضروری کام ہے۔“

”فرمایئے۔“

”اب نہیں، کل کا کوئی وقت دو جب تمھیں بالکل فرصت ہو۔ تمہاری مدد درکار ہے۔“

”میں حاضر ہوں۔ سہ پہر کے بعد مُجھے فرصت ہی فرصت ہے۔“

"تو پھر کل شام آٹھ بجے ٹینس لان میں۔"

"آپ بے حد پریشان ہیں، خدانخواستہ کوئی بری خبر یا کوئی حادثہ!"

"نہیں نہیں۔ کوئی بری خبر نہیں، ویسے ہی ایک کام ہے۔"

ہم دونوں ہال کمرے میں چلے آئے۔

حسن ابھی تک پیانو بجا رہے تھے اور جونز وائلن کم بجا رہے تھے جھوم زیادہ رہے تھے۔

موسیقی ختم ہوئی، تالیاں بجیں۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔

میں حسن اور مسز حسن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو جانتے تک نہ تھے اور اب ان کی محبّت پر لوگ رشک کرتے ہیں۔ ان کی محبّت مثالی ہے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ یہ محبّت دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور دونوں کتنے خوش رہتے ہیں۔

اگلے روز سہ پہر کو میں اس کے ہاں گیا۔ وقت سے ذرا پہلے چلا گیا تھا، وہاں صرف "ص" ہی ملیں۔ ان کے ابّا ابھی تک دفتر سے واپس نہیں آئے تھے۔ "ص" نے

نہایت خوش نما لباس پہن رکھا تھا۔ رنگوں کے انتخاب میں وہ خوش مذاق معلوم ہوتی تھیں۔ ہم نے آدھ گھنٹے انتظار کیا پھر ان کے ابّا کا فون آ گیا کہ مصروفیت اس قدر ہے کہ شام سے پہلے نہیں آ سکیں گے۔ ''ص'' کی امّی نہ جانے کہاں تھیں؟ میں نے قصداً اُنکے متعلق نہیں پوچھا۔ ممکن ہے یہاں آئی ہی نہ ہوں۔

ہم نے چائے پی۔ اس دوران میں بہت کم باتیں ہوئیں۔ بس ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک لمحے کے لیے دیکھا اور آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ کچھ دیر کنکھیوں سے دیکھا۔ پھر جو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا ہے تو بس نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ پھر ''ص'' اپنا البم لے آئیں جسے صوفے پر بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ ان کی کئی تصویریں تو اتنی پیاری تھیں کہ جی چاہا مانگ لوں۔ پھر سوچا اتنی جلدی کیا ہے۔ شاید مانگنے کی نوبت ہی نہ آئے اور ''ص'' خود یہ تصویریں دے دیں۔

پھر میں نے کلب چلنے کو کہا، لیکن کار ان کے ابّا لے گئے تھے اور میری موٹر سائیکل کی سائیڈ کار نہیں تھی۔ آخر طے ہوا کہ انہیں موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھائیں۔

میں انہیں اپنے ہاں لے آیا۔ انہوں نے میرے کمرے دیکھے جاں سب کچھ الٹ پلٹ پڑا ہوا تھا۔ ایک چیز بھی قرینے سے نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے چیزوں کو

ترتیب دینی شروع کی۔ کمروں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ کُچھ دیر ہم لگاتار ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

کلب پہنچ کر دیکھا کہ بیشتر لوگ باہر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ سب نے دیکھ لیا کہ میں ”ص“ کو موٹر سائیکل پر لایا ہوں، لیکن اس مرتبہ میں بالکل نہیں گھبرایا۔ ”ص“ کو خواتین کے پاس چھوڑ کر ٹینس لان کی طرف چل دیا۔ جلدی سے ”ن“ میرا راستہ کترا کر گزر گئیں۔

”سنئے۔ میں نے انہیں روک لیا۔“ یہ تو وہی ہوا کہ:

راہ میں ان سے ملاقات ہوئی

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

”اب یہ شعر وغیرہ ان جنگلات والی خاتون کو سنایئے۔ آپ اکیلے کیوں پھر رہے ہیں؟ وہ مس جنگلات کیا ہوئیں؟“

”لیکن۔“

"میرے ساتھ ساتھ آیئے" اور میں ساتھ ہو لیا۔ وہ مُجھے ایک کمرے میں لے گئیں، پردہ اٹھایا اور بولیں۔ "زمانے بھر کے ہری چُگ صاحب تشریف لاتے ہیں۔"

اور اندر جتنی لڑکیاں بیٹھیں تھیں سب کھڑی ہو گئیں۔ "ن" "ط" "ب" وغیرہ سب رُوٹھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے انہیں منایا۔

"ویسے آپ ہری چُگ ضرور ہیں۔"

"دریں چہ شک" میں نے کہا۔

"میں ایک ریکارڈ بجا سکتی ہوں؟" 'ع' نے جو گراموفون کے پاس کھڑی تھیں پوچھا۔

"اگر آپ اپنا وہی پسندیدہ ریکارڈ بجانا چاہتی ہیں تو ہم ہرگز سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں آخر؟"

"کوئی تُک بھی ہے اس گانے میں؟ تو چپکے چپکے بول مینا، کیا بات ہوئی؟ بھلا مینا بےچاری کے بولنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر ساجن کہیں گرفتار وغیرہ نہیں

ہوئے تو وہ ویسے بھی آجائیں گے۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ مینا کو زور سے بولتا سُن کر ساجن فوراً واپس چلے جائیں۔ دراصل آپ لوگوں کی دلچسپی زرّی کی ساڑھی، سونے کی بِندیا، موتیوں کی مالا سے ہے نہ آپ کو ساجن کی پرواہے اور نہ مینا کی!"

"ع" کھسیانی ہو گئیں۔

"تو پھر وہ لگاؤں۔ یہ کون آج آیا سویرے سویرے۔ کہ دِل چونک اٹھا سویرے سویرے۔"

"پرسوں یہی ریکارڈ ایک انگریز دوست نے سُن لیا۔ اس نے خواہش کی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کروں۔ ترجمہ سُن کر وہ کہنے لگا۔ کہ دراصل غلطی محبوب کی ہے۔ اوّل تو اس قدر صبح آنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے یہ کہ محبوب کو پہلے وقت پوچھنا چاہیے تھا۔ اگر واقعی اس نے اپائنٹمنٹ نہیں لی تو اسے کوئی حق نہیں کہ کچّی نیند سے کسی کو اُٹھا کر چونکا دے۔ ادھر عاشق کی بھی غلطی ہے جس نے ایسا عجیب محبوب چُنا ہے، جسے وقت کی کوئی تمیز نہیں۔"

"تو پھر آپ ہی اپنی پسند کا بجائیے۔" "ع" ہار کر بیٹھ گئیں۔

میں نے اُٹھ کر ایک انگریزی ریکارڈ لگا دیا جس کا گانا یہ تھا کہ اگر میں نے کبھی دوبارہ محبّت کی تو تم سے ہی محبّت کروں گا۔ اگر میں نے اپنا دِل دوبارہ کھویا تو وہ تمہاری ہی نذر ہو گا۔"

"غلط ہے غلط ہے۔" "ن" نے ریکارڈ بند کر دیا۔ "یہ گانا ہری چگوں کا ہرگز نہیں ہے۔ آپ تو وہ گایئے۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!"

"دریں چہ شک!" میں نے کہا۔

اتنے میں مسز حسن صاحب کا بلاوا آ گیا۔ ان کے ساتھ ٹینس کے دو سیٹ کھیلے۔ کُچھ دیر کے بعد سب ٹہلتے ٹہلتے دُور نکل گئے۔ ایک بینچ پر بیٹھ کر باتیں شروع ہوئیں۔ چاندنی میں ان کا چہرہ اتنا زرد معلوم ہو رہا تھا جیسے خزاں کا سوکھا ہو پتّہ۔ ان کی باتیں بے ربط تھیں، چہرے پر گھبراہٹ تھی اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ بولیں:

"ایک درخواست ہے، اسے میری التجا سمجھئے۔ کیا آپ حسن صاحب سے مُجھے تھوڑی سی چھُٹّی دِلا سکتے ہیں؟"

"یعنی؟"

"یہ کہ میں پندرہ بیس دونوں کے لیے کشمیر جانا چاہتی ہوں"

”آپ نے حسن صاحب سے خود گفتگو نہیں کی؟ انہوں نے کیا جواب دیا؟“

”میں، میں خود ان سے نہیں پوچھ سکتی۔ اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ وہ بھی ساتھ جائیں۔ اکیلی جانا چاہتی ہوں۔“

”لیکن آپ کشمیر کیوں جانا چاہتی ہیں...؟ نومبر کا مہینہ ہے سردیاں شروع ہو چکی ہیں۔“

”یہ میں نہیں بتا سکتی، لیکن اگر آپ کسی طرح ان سے اجازت لے سکتے ہوں تو دریغ نہ کیجیے۔ کہہ دیجیے کہ صحّت اچھی نہیں۔ کسی بیماری کا بہانہ کر دیجیے اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کشمیر تجویز کر دیجئے۔ وہ ضرور اجازت دے دیں گے۔“

”اس صورت میں وہ بھی چھُٹّی لینے کی کوشش کریں گے اور آپ کے ساتھ جائیں گے۔“

”نہیں میں تنہا جانا چاہتی ہوں۔ دیکھئے، اتنے بہانے ہو سکتے ہیں۔ میں کہ کشمیر میں میری کوئی سہیلی ہے، وہاں ماتم ہو گیا ہے۔ انہوں نے تار بھیجا ہے یا کُچھ اور کہہ دیجیے۔“

”لیکن وجہ کیا ہے؟ آپ آخر کیوں وہاں جانا چاہتی ہیں؟“

"معاف کیجیے میں وجہ نہیں بتا سکتی۔" وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ میں نے ان کو اس قدر پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ہفتوں سے مجھے نیند نہیں آئی۔ بس ایک دھن لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں۔"

اس کے بعد جیسے انہیں اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور انہوں نے اپنی کہانی سنائی۔ ایسی کہانی کہ میں دم بخود ہو گیا۔ یہ مسز حسن بول رہی ہیں کیا؟ میرے کان مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے؟ کیا یہ سب کچھ ہے؟ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ کہہ رہی تھیں۔ "اور پہلے پہل مجھے اس سے نفرت تھی بے حد نفرت تھی اس کا سایہ تک زہر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کا مضحکہ اڑایا۔ اسے نظر انداز کیا۔ سدا اس کی ہتک کی۔ اس نے اپنی محبّت میرے قدموں میں رکھ دی تھی جسے میں نے بری طرح ٹھکرایا لیکن اس کا خبط کم نہ ہوا۔ میری نگاہوں میں وہ ایک خود غرض، مغرور اور بد تمیز لڑکا تھا۔ میرے دِل میں اس کی نفرت دن بدن بڑھتی گئی، یہاں تک کہ کئی مرتبہ کھلم کھلا اس کی توہین کی۔ اس کی عجیب اور خواہ مخواہ کی محبّت کا مذاق اڑایا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور ایک روز حسن صاحب نے ابّا کے ساتھ مجھے کہیں دیکھ لیا۔ ایک ڈیڑھ ہفتے کے بعد انہوں نے ابّا سے گفتگو کی اور وہ مان گئے۔ مجھ

سے پوچھا گیا۔ مُجھے اس سے اتنی نفرت تھی کہ میں نے حسن صاحب کا پیغام قبول کر لیا۔ جب میری شادی ہوئی تو اس وقت مُجھے کسی سے محبّت نہیں تھی۔ حسن صاحب کو میں بالکل نہیں جانتی تھی۔ اب تک میری زندگی میں ایک ہی شخص آیا تھا جسے میں ہمیشہ دھتکارتی رہی لیکن اپنی شادی پر کُچھ مایوسی ضرور ہوئی۔ میں سمجھتی تھی کہ انتخاب کرنے کے اور بہت سے مواقع ملیں گے۔ شاید اس سے بہتر لڑکا چُن سکوں گی، کسی ہم مذاق کو۔ لیکن یوں ہونے کے بجائے خود مُجھے کسی نے چُن لیا اور میں دیکھتی رہ گئی۔ آناً فاناً میں مسز حسن بن چکی تھی۔ شادی کے بعد ہم کشمیر گئے۔ وہاں بھی میرے دِل میں اس کی نفرت بدستور رہی۔ پھر حسن صاحب مُجھے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے۔ دو سال کے بعد واپس گھر پہنچی۔ وہاں اس کی ناکامیوں اور بربادیوں کے قصّے سُنے۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل تباہ کر لیا تھا۔ ایک روز میں اس کی بہن سے ملنے گئی جو میری سہیلی تھی۔ واپسی پر ہم ان کی کار میں آئے جسے وہ چلا رہا تھا۔ تب میں نے اسے دیکھا۔ صرف اس کی پشت دیکھ سکی۔ سوکھی ہوئی گردن، سکڑے ہوئے شانے، پیلا رنگ، سر کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے، رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مُجھے اس پر بے حد ترس آیا۔ یہ اس کا کیا حال ہو گیا! ایسے مضبوط تندرست و توانا نوجوان کی جگہ ایک دبلے پتلے اور بے حد غمگین انسان کو دیکھ رہی تھی جس کی ہر بات سے بڑھاپا ٹپکتا تھا۔ جب ہم گھر پہنچے تو وہ اتر کر چپکے سے

ایک طرف چلا گیا۔ اسے میری موجودگی کا احساس بھی تھا پھر بھی اس نے مُجھے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور پہلے ہر وقت اسے یہی دُھن رہتی تھی کہ کسی طرح مُجھے دیکھ لے۔

جب واپس آئی تو یہ خیال جیسے میرے روئیں روئیں میں رچ گیا۔ صبح شام سوتے جاگتے ہر وقت اس کا دھیان رہنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے اس کی زندگی برباد کی ہے۔ اس کی تباہی کی ذمہ دار ہوں۔ اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ یہ پچھتاوا بڑھتا گیا اور جب میں نے اپنے دِل کو ٹٹولا تو وہاں نفرت نام کو نہ تھی۔ کیا سچ مچ اتنے دنوں سے نفرت رہی تھی؟ میں کہہ نہیں سکتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا اور میرا نہایت مضبوط رشتہ ہو۔ اس نے اپنی سب سے قیمتی چیز میرے قدموں میں رکھ دی تھی۔ اپنا غرور، اپنی خودداری، اپنا دِل، سب کُچھ جسے میں نے بار بار ٹھکرایا۔ پھر بھی عرصے تک وہ سسکتی ہوئی اُمّید اور آنسوؤں کو چھپائے اسی لگن میں رہا کہ شاید میرے دِل میں اس کے لیے رحم پیدا ہو جائے۔ حتیٰ کہ میری شادی ہو گئی اور اب محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نفرت نہیں تھی بلکہ کُچھ اور تھا۔ شاید وہ انس تھا جسے میں نفرت سمجھتی رہی۔ جب اس کی برائیاں کیا کرتی تو میرا دِل دھڑکنے لگتا۔ اس خیال سے کہ میں اس شخص کا ذکر کر رہی ہوں جس کی قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کے متعلق جو کُچھ میں نے اوروں سے کہا وہ شاید یہ ظاہر کرتا تھا کہ مُجھے اس سے دلچسپی ہے۔ تبھی

میں اسے برا کہتی تھی، اس کا مذاق اُڑاتی تھی، اس لیے کہ اسے اپنا سمجھتی تھی اور وہ مُجھے عزیز تھا، لیکن یہ باتیں مُجھے کئی سال کے بعد معلوم ہو سکیں۔ شادی کے بعد ان کا احساس ہوا۔ اپنی شادی سے مایوس سی ہوں۔ میرا ایک خواب بھی تو پورا نہیں ہوا۔ حسن صاحب نہایت اچھے ہیں۔ ہنس مکھ ہیں۔ حد سے زیادہ خیال رکھتے ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اس زندگی سے غیر مطمئن ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھولی بھٹکی ادھر ادھر پھر رہی ہوں اور راستہ نہیں ملتا۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود بھی ان کے اور میرے درمیان ایک دیوار کھڑی ہے جسے میں عبور نہیں کر سکتی۔ میں کتنی بُری ہوں، پرلے درجے کی ناشکر گزار۔ مُجھے زندگی کی تمام نعمتیں میسر ہیں۔ وہ مُجھے کس قدر چاہتے ہیں۔ آج تک انہوں نے میری ایک بات بھی رد نہیں کی۔ ایسے مہربان اور حلیم رفیق بہت کم ملتے ہیں۔ خدایا میں کتنی بُری ہوں۔ میرا گناہ ناقابلِ عفو ہے اور انہیں یقین ہے کہ میرے دِل میں فقط وہ ہی یہ ہیں۔ اس لیے ان کا برتاؤ ایسا ہے۔ وہ مُجھے دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ لیکن پچھلے مہینے میں نے کسی سے سُنا تھا کہ وہ بدنصیب ان دِنوں کشمیر میں ہے۔ آج کل اس کے اوقات بڑی اداسی اور تنہائیوں میں کٹتے ہیں۔ وہ آوارہ گردوں کی طرح پھرتا رہتا ہے۔ نہ اس کا کوئی خیال رکھنے والا ہے اور نہ کوئی رفیق۔ پہلے اس جیسا خوش پوش اور زندہ دِل لڑکا کہیں نہ تھا۔ اور اب سُنا ہے کہ اسے لباس کی پرواہ ہے نہ حلیے کی۔ پہلے اس کے دِل میں اُمنگیں تھیں، مستقبل کے لیے

بڑے بڑے ارادے تھے اور اب اس نے سب کُچھ چھوڑ چھاڑ کر آوارہ گردی اختیار کرلی ہے۔ بالکل سیلانی بن گیاہے۔ ان دنوں تواس کا ایک دوست نہیں۔ گھر سے روپے منگامانگا کر کوڑیوں کی طرح لٹاتا ہے۔ اس کے والدین پہلے تو بہت پریشان رہے۔ پھر انہوں نے بھی مایوس ہو کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور آج کل وہ کشمیر میں ہے۔ جن خوشنما گوشوں میں ہماری شادی کے پہلے چند ماہ گزرے وہ وہیں غمزدہ اور اداس پھر رہاہو گا۔ میرا دِل تڑپ رہاہے۔ کسی طرح پر لگ جائیں اور میں اسے جاکر سنبھال لوں۔ اسے سہارادوں۔ مجھ سے اب یہ سب کُچھ سنا نہیں جاتا۔ میں نے آج تک اسکی محبّت کا جواب نہیں دیا لیکن اب میں اس سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ شاید وہ میرا کہا مان جائے، شاید یہ سنبھل جائے۔ میں جانتی ہوں کہ اب میں کسی کی بیوی ہوں اور مجھ پر ذمہ داریاں عائد ہیں لیکن میرا دِل بغاوت کر رہاہے۔ میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن نہیں۔ نہ اس کا خیال اپنے دِل سے نکال سکتی ہوں۔ اور سب سے بڑا غم جو مُجھے کھائے جاتا ہے یہ ہے کہ حسن صاحب مُجھے جان سے عزیز سمجھتے ہیں۔ انہیں میرا کس قدر خیال ہے۔ وہ میری پرستش کرتے ہیں اور میں! مسز حسن رونے لگیں۔

میں کُچھ دیر یوں گم سم بیٹھا رہا جیسے بجلی آن گری ہو۔ پھر انہیں یقین دلایا کہ میں پوری کوشش کروں گا۔ حسن صاحب ضرور مان جائیں گے۔ انہوں نے اپنے

آنسو خشک کر لیے اور ہم دونوں واپس ہال کمرے میں آ گئے جہاں حسن پیانو بجا رہے تھے۔

"ص" میری منتظر تھیں۔ ایک کونے میں بیٹھ کر ہم کیرم کھیلنے لگے۔ جو کُچھ انہوں نے کہا کہ میں نے بالکل نہیں سنا۔ میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ یہ باتیں کر رہی تھیں۔شاید ان باتوں میں بے حد مٹھاس تھی شاید انہوں نے رات کی رانی کے پھُولوں کا ذکر کیا یا چاندنی رات کے متعلق کُچھ کہا۔ ہم دونوں باہر آ گئے اور پلاٹ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے میری سالگرہ کے متعلق پوچھا۔ وہ میرے لیے پُل اوور بننا چاہتی تھیں۔ سالگرہ میں چند دن ہو گئے تھے اور اس موقع پر وہ پل اوور تحفتاً پیش کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ تب انہوں نے ناپ لینا چاہا اور اپنی سفید سفید انگلیوں اور انگوٹھے سے بالشت بنا کر میرے سینے کو ناپا۔ دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔

اگلے روز میں کلب نہیں گیا اِدھر اُدھر پھر تا رہا۔ نہ کُچھ کرنے کو جی چاہتا تھا نہ تنہا بیٹھنے کو۔ دو روز اسی طرح گزرے۔ پھر کلب گیا محض حسن کو ملنے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ جب ہم دونوں اکیلے ہو گئے۔ تب میں نے چھٹی کے متعلق دریافت کیا کہ کب لینے کا ارادہ ہے۔ وہ بولے ارادہ بھی ہے اور ان دونوں مل بھی سکتی ہے لیکن چند مجبوریاں ہیں۔ میں نے کام کی زیادتی کا ذکر کیا۔ بولے۔

”نہیں کام وغیرہ نہیں کچھ اور بات ہے۔ میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ آج ہی چھٹی لے کر چلا جاؤں لیکن ایک ایسی وجہ ہے کہ میں!“

کُچھ کہنے لگے تھے کہ یکایک خاموش ہو گئے۔

”اچھا تو پھر کوئی ذاتی معاملہ ہو گا!“

”ذاتی ہے بھی اور نہیں بھی۔ کُچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ان دنوں اس قدر پریشان ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔“

”مسز حسن کی صحت!“ میں نے شروع کیا۔

”یہی وجہ ہے۔ میں مسز حسن کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ اسی لیے چھٹی نہیں لیتا۔ اگر کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہو کہ میں اکیلا کُچھ دنوں کے لیے باہر جا سکوں اور بیگم یہیں رہ جائیں! کیا آپ بیگم سے کوئی بہانہ نہیں کر سکتے؟ مثلاً یہی کہ میری صحت گرتی جارہی ہے اور میرے لیے آب و ہوا کی تبدیلی از حد ضروری ہے۔“

”لیکن آپ تنہا کیوں جانا چاہتے ہیں؟“

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ بس سمجھ لیجیے کہ میں کہیں جانے کو تڑپ رہا ہوں اور اگر آپ مدد کریں تو شاید یہ مشکل حل ہو جائے۔"

"لیکن آپ!"

"ٹھہریئے۔ میں سب کُچھ بتائے دیتا ہوں۔ پہلے وعدہ کیجیے کہ یہ سب کُچھ سننے کے بعد آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کریں گے۔ آپ میرے دوست ہی رہیں گے نا؟"

"آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا"

"مُجھے یقین ہے کہ آپ میرے دوست رہیں گے۔"

اور اس کے بعد انہوں نے ایک طویل کہانی سنائی۔ اپنی محبّت کی کہانی، اپنی واحد محبّت کی۔ اور جب وہ اپنی ناکامیاں بیان کرنے لگے تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں بت بنا سب کُچھ سنتا رہا۔ میرے تخلیق کردہ نظارے دھندلے پڑ گئے۔ رنگین خواب پھیکے پڑ گئے۔ وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے ایک شکست خوردہ انسان بیٹھا اپنی داستانِ غم سنا رہا تھا۔

"اور جب ہم جدا ہوئے تو میں نے یہ سمجھا تھا کہ اب زندہ نہ رہ سکوں گا۔ لیکن یہ دنیا کُچھ ایسی جگہ ہے اور زندگی ایسی عجیب چیز ہے کہ رنج و غم، مصیبتیں ناکامیاں

خواہ کتنی ہی ہوں زندہ رہنے کی خواہش کبھی نہیں مرتی۔ خواہ مفلوج ہو کر گھٹتے رہیں، آنکھوں کا نور چھِن جائے، اندھے ہو کر راستہ ٹٹولنا پڑے، کُچھ بھی ہو جائے، بس یہی جی چاہتا ہے کہ زندہ رہیں۔ جیتے چلے جائیں۔ اب مُجھے دیکھ لیجیے میں اب تک زندہ ہوں۔ ہر وقت مسرور نظر آتا ہوں۔ اچھے عہدے پر تعینات ہوں۔ میں نے شادی بھی کی ہے۔ بیگم مجھ پر جان نثار کرتی ہیں۔ زندگی کی مسرتیں مُجھے مل چکی ہیں فقط ایک گھاؤ ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ جب اس کا خیال آتا ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا شوہر بہت اچھا انسان ہے اسے بھی سب کُچھ میسر ہے لیکن اِدھر میں زندگی سے مطمئن نہیں ہوں اُدھر اس کی زندگی بھی بے چین سی ہے۔ ان باتوں کو مدّت گزر چکی مگر میں اب بھی محبّت کا بھوکا ہوں۔ مُجھے محبّت کبھی نہیں ملی۔ میں شادی فقط اس لیے کی تھی، لیکن اپنی شادی سے بالکل مایوس ہوں۔ جب کبھی یہ تنہائی، محبّت کی یہ پیاس، روح کی یہ تڑپ بہت بڑھ جاتی ہے تو کسی نہ کسی طرح موقع پا کر اسے ضرور دیکھ آتا ہوں۔ اس سے چند باتیں کر لینے یا فقط ایک نظر دیکھ لینے سے بڑی تسکین ملتی ہے۔ پچھلے سال اس سے آدھ گھنٹے تک باتیں کیں اور اب تک خمار ہے۔ اب مُجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنے ابّا کے پاس آئی ہوئی ہے۔ جب سے یہ سُنا ہے میرا دِل مچل رہا ہے۔ اگر بیگم کسی طرح اجازت دے دیں تو میں آج چلا جاؤں۔ ادھر یہ خیال ہر وقت کچوکے لگاتا ہے کہ بیگم مُجھے بے حد چاہتی ہیں۔ ان

کی زندگی میں صرف میں ہی ہوں۔ پھر بھی میرے لیے وہ اجنبی ہیں۔ اور اب میں کچھ بوڑھا سا ہوتا جا رہا ہوں۔ صرف دیکھنے میں جوان اور تندرست لگتا ہوں۔ شاید یہ بڑھاپا جسم کا نہیں بلکہ روح کا ہے۔ میں اسے اپنی ہڈیوں میں محسوس کرتا ہوں۔ اور وہ دن دور نہیں جب میرے دِل اور دماغ کی تپش ٹھنڈی ہو کر یخ ہو جائے گی۔ تب شاید میں اس عذاب کو بھول جاؤں گا۔ یہ تبدیلیاں ہم میں خاموشی سے آتی ہیں۔ کسی عمر رسیدہ اور جھریوں والے چہرے کو دیکھتے وقت یہ خیال تک نہیں آتا کہ کبھی یہ دمکتا ہوا حسین چہرہ تھا جس میں بلا کی کشش تھی۔ انسان کی یہی زندگی ہے۔ اور بچپن میں ہمیں طرح طرح کے دھوکے ہوتے ہیں۔ انہی چیزوں کو ہم کسی اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔ چوک میں کھڑے ہوئے سپاہی کو دیکھ کر اس پر رشک آتا ہے کہ یہ شخص کھڑا حکم دے رہا ہے، محض اپنی شان جتانے کے لیے۔ اور ریل کے گارڈ کو ہم بے حد خوش نصیب تصوّر کرتے ہیں جو ہر وقت ریل میں مفت سفر کرتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خاکے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں مُنہ کھولے سامنے آ جاتی ہیں۔ تب انسان وہ تنہائی محسوس کرتا ہے جو ہمیشہ اسے گھیرے رہتی ہے۔ خوفناک تنہائی جس کے چنگل سے نجات مشکل ہے۔ وہ جس طرح تنہا خواب دیکھتا ہے، اسی طرح تنہا زندہ رہتا ہے اور اتنے میں اس کے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ کمر دوہری ہو جاتی ہے اور وہ زندگی

زندگی پکارتا ہوا یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سے قیام میں وہ رفیقوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اوّل تو کوئی ملتا نہیں، اور جب اتفاق سے ملتا ہے تو قدرت اسے کہیں دُور پھینک دیتی ہے اور یہ قدرت کا تحفہ، یہ ابدی تنہائی ہمیشہ انسان کو گھیرے رہتی ہے۔"

وہ دیر تک باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ان کی آواز بھرا گئی۔

صبح کو حسن مجھ سے ملنے آئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"اب تک آپ نے بیگم سے آنے جانے کے متعلق تو کُچھ نہیں کہا؟"

"نہیں! بات یہ کہ وہ!" میں معذرت کرنے لگا۔

"اب قطعاً ذکر نہ کیجیے کیونکہ آج اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنے ابّا کے ہاں آئی ضرور تھی لیکن اس کا شوہر پرسوں اسے واپس لے گیا۔ پہلی خبر بہت دیر میں ملی۔ اب میرا جانا بے سود ہے۔"

"بہت اچھا!"

کُچھ دیر باتیں کر کے وہ چلے گئے۔ اگلے روز میں کلب گیا، واپسی پر مسز حسن ملیں۔

وہ بدستور اداس تھیں۔ انہوں نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”آپ نے حسن صاحب سے میرے لیے اجازت تو نہیں مانگی؟“

”جی نہیں! اب تک کوئی موقع نہیں مل سکا؟“

”اب ان سے اس کا ذکر بالکل نہ کیجیے۔ اب میں کہیں نہیں جانا چاہتی۔ کسی نے لکھا ہے کہ اب وہ کشمیر سے واپس چلا گیا ہے۔ اب وہ وہاں نہیں ہے اور کسی کو اس کا پتہ معلوم نہیں۔ خُدا جانے وہ اب کہاں ہے؟“

اگلے روز میری سالگرہ تھی۔ دوپہر کو حسن اپنی کار میں جاتے ہوئے مل گئے۔ وہ مُجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے کُچھ عزیز آئے ہوئے تھے۔ مسز حسن نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں حسن نے اپنی جیب سے ایک سنہرا ہار نکالا۔ یہ ان کا تحفہ تھا اپنی بیگم کے لیے۔ مسز حسن اندر گئیں اور ایک خوبصورت سی گھڑی ساتھ لائیں۔ ”آپ ہمیشہ گھڑی کھو دیتے ہیں یہ میں آپ کے لیے لائی تھی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے گھڑی حسن کی کلائی پر باندھ دی۔ دونوں ہنسنے لگے اور میں ان تحفوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ کیسے

تحفے ہیں؟ شوہر اور بیوی آج ایک دوسرے کو تحفے کیوں پیش کر رہے ہیں؟ آج ایسی کیا ضرورت پیش آگئی۔ کیا واقعی ہی تحفے ایک دوسرے کے لیے چنے گئے تھے یا اوروں کے لیے جنہیں مجبوراً پیش نہ کیا جا سکا۔ میں ان کے عزیزوں سے باتیں کرتا کرتا باغ میں آگیا۔ وہاں سے دیکھا کہ وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں، غالباً تحفوں کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ اس شام کو کلب میں پارٹی تھی۔ میری سالگرہ پر چاروں طرف سے مبارکباد ملی۔ تحفے بھی ملے۔ "ص" میرے لیے پُل اوور لائی تھیں جسے انہوں نے اتنے مختصر وقفے میں بُن لیا تھا۔ میرے سامنے چیزوں کا ڈھیر لگ گیا لیکن نگاہیں بار بار حسن کی کلائی پر پڑتی تھیں اور مسز حسن کی گردن پر۔ میں وہ دونوں تحفے دیکھ رہا تھا جو انہوں نے ایک دوسرے کو دیئے تھے۔

"ص" نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ رات کے نو بجے ریڈیو پر کوئی خاص ڈرامہ تھا یا تقریر، مُجھے نو بجے بلایا۔ یہ بھی کہا کہ ان کے ہاں رات کو سبز روشنی ہوتی ہے۔ وہ دریچے میں بیٹھ کر میرا انتظار کریں گی اور ان کے ابّا آج دورے پر گئے ہوئے ہیں۔

جب میں سب کا شکریہ ادا کر چکا تو حسن پیانو بجانے لگے اور جونز نے اپنا وائلن سنبھالا اور جھومنے لگے۔ حسن کی انگلیاں پیانو پر بڑی پھرتی سے چل رہی تھیں۔

وہ گھڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ جب مسز حسن اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتیں تو وہ جگمگ جگمگ کرتا ہوا ہار آنکھوں کے سامنے کوند جاتا۔

جب میں گھر پہنچا تو نہایت دلکش چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، اتنی تیز کہ دن کا گمان ہوتا تھا۔ درختوں کے اوپر، پڑوس کے کمروں میں سبز روشنی ہو رہی تھی اور دریچے سے ایک پیارا چہرہ جھانک رہا تھا، جس کی لٹیں ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ نو بج چکے تھے اور "ص" میرا انتظار کر رہی تھیں۔

میں نے ان کی لہراتی لٹوں کو دیکھا۔ پھر ایک تاریک سا خیال دِل میں آیا کیا یہ پہلی مرتبہ انتظار کر رہی ہیں؟ کیا میں پہلا لڑکا ہوں جسے انہوں نے پسند کیا ہے؟ کیا یہ انکا پہلا تحفہ ہے؟ یا یہی کھیل کئی مرتبہ دہرایا جا چکا ہے؟ آنکھوں کی گہرائیوں کا کسے علم ہے۔ ان آنکھوں میں کون کون سما چکا ہے؟ یہ چہرہ کس کس کے لیے بے قرار رہ چکا ہے؟ یہ کون جانتا ہے؟

تب ایک عجیب سی اداسی دِل میں اُتر گئی۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی سی بڑھتی گئی۔ یہ دلفریب چاندنی رات پھیکی دکھائی دینے لگی۔ اور میں واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میری نگاہوں میں وہ تحفے بسے ہوئے تھے جو حسن اور ان کی بیگم نے ایک دوسرے کو پیش کیے تھے۔

یہ چونکا دینے والا تماشا میں نے کیوں دیکھ لیا؟ میں اپنے خوابوں سے اتنی جلدی بیدار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں ابھی یہ سب کُچھ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

تب اس ابدی تنہائی کو پہلی مرتبہ محسوس کیا جو انسان کی گھُٹی میں پڑی ہوئی ہے۔، جو عمر بھر سائے کی طرح ساتھ رہتی ہے۔ جس کا تعلق ماحول سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔

وہ اداسی گہری ہو گئی حتیٰ کہ آنسوؤں کا ایک سیلاب میری پلکوں تک آ کر رُک گیا۔ یہ میں نے کیوں دیکھ لیا؟ کاش کہ میں کُچھ نہ دیکھتا۔ اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ اپنا دِل پتھّر بنا لیتا۔

رقابت

میں ڈرتا ڈرتا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ خیال تھا کہ نظر بچا کر لائبریری میں چلا جاؤں گا لیکن جیسے وہ لوگ منتظر ہی تھے۔ جھپٹے اور مُجھے دبوچ لیا۔ بولے چلو بلیرڈ کھیلتے ہیں۔

مُجھے بلیرڈ سے سخت نفرت ہے۔ کھیل میں یا تو پوری ورزش ہو یا پھر بالکل چپ چاپ بیٹھ کر کھیلا جائے جیسے شطرنج ہے (ویسے شطرنج بھی مُجھے پسند نہیں) لیکن اس بلیرڈ میں نہ تو ورزش ہوتی ہے اور نہ آرام سے ہی بیٹھ سکتے ہیں۔

میں ضدی بن کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب سب تنگ آ گئے تو "ق" نے ترنگ میں آ کر فرمایا کہ مشرقی ملکوں میں شادی کرنا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے پتّے دیکھے بغیر کوئی "سیون نو ٹرمپس" کہہ دے۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا اور اب شادی پر گفتگو ہونے لگی۔ کچھ دیر میں ہم اُکتا گئے اور انگیٹھی کے پاس جا بیٹھے۔ موضوع پھر بدل گیا اور دوستی پر باتیں چھیڑ گئیں۔ "ذ" نے کہا: "میرا خیال ہے کہ جو ایک

مرتبہ دوست بن جائے وہ ہمیشہ دوست رہتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جو اب دوست نہیں رہا وہ کبھی دوست تھا ہی نہیں۔"

اس پر مختلف رائیں دی گئیں۔ دوستی سے موضوع دشمنی کی طرف چلا گیا۔ سب لوگ دشمنی کو اہمیت دے رہے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بحث ہو رہی تھی۔

پھر "ق" نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بیان دیا۔ "اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اسمِ اعظم کیا ہے تو میں فوراً کہہ دوں کہ وہ ہے معافی مانگنے والے کا ایک فقرہ۔ کہ مُجھے معاف کر دیجیے۔ خواہ کتنی زبردست دشمنی ہو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی یہ فقرہ کہہ دے تو سب دُھل سکتا ہے، برسوں کا کینہ صاف ہو سکتا ہے اور۔"

"لیکن!" "ذ" نے ٹوکا۔ "وہ دشمنی ہی کیا جو معافی سے جاتی رہے، جس شخص کی زندگی اصولوں کی پابند ہو وہ خواہ مخواہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ دشمنی تو ایک نہایت گہرا جذبہ ہے اور جو لوگ زندگی کو سنجیدگی سے نہیں لیتے وہ مکمل انسان نہیں ہیں۔ کم از کم میں تو زندگی اور اس کے اصولوں کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔"

"بھئی معاف کرنا!" "ق" نے کہا۔ "جب کوئی سنجیدگی سے انسانی زندگی کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو مُجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ مان لیا کہ ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ ہے

لیکن یہ تو بتایئے کہ خود انسان میں یا اس کی زندگی میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو نایاب ہو یا دیرپا ہو؟ آخر ہم کس بات پر اِتراتے ہیں؟ جن دِنوں میں یونیورسٹی میں تھا میرا ایک دوست میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ میں اکثر اس سے ملنے جایا کرتا۔ ایک روز وہ لاش کو چیر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے انسانی لاش کو دیکھا اور شاید اس روز پہلی دفعہ مُجھے اپنے حقیر پن اور بے مائیگی کا احساس ہوا۔ مُجھے اس لاش پر ذرا ترس نہیں آیا بلکہ لاش سے کراہت محسوس ہوئی اور ساتھ ہی انسان سے بھی نفرت ہونے لگی۔ جس کا انجام لاش بننا ہے۔"

"لیکن وہ مُردہ جسم تھا۔"

"اس روز مُردہ جسم دیکھا تھا لیکن اس کے بعد زندہ لاشیں بھی دیکھیں۔ گھٹتے ہوئے اپاہج جسم، ایسے جسم جن کو بیماریوں کی دیمک نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ہسپتال میں جایا کرتا تھا، جہاں لوگ دن رات کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے تھے۔ مُجھے ان کے مرنے پر بھی کبھی حیرانی نہیں ہوئی۔ تعجّب ہوتا تھا اس پر کہ لوگ گھن لگے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے جسموں کو لے کر زندہ کیونکر رہتے ہیں۔ یہاں ایک بوڑھا شخص کراہ رہا ہے جس کا دِل عمر بھر کی محنت مشقت کے بعد تھک چکا ہے۔ مرض لاعلاج ہے پھر بھی اسے جینے کی تمنا ہے۔ اپنی زندگی کی بہار اور خزاں دونوں دیکھ چکا ہے۔ زندگی سے پوری قیمت

وصول کر چکا ہے۔ پھر بھی اسے زندہ رہنے کی ہوس ہے۔ وہاں ایک نوجوان پڑا ہے جسے ایک حادثے نے ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا مگر یہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔۔۔۔ ادھر ایک ننھا سا بچہ سانس لینے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اس کے گلے میں ایک جھلّی بن گئی ہے جو ہوا کو اندر نہیں آنے دیتی۔ لیکن سب سے عجیب بیکاری تپِ دِق ہے۔ یہ مرض جہاں سینے کو چپکے چپکے چھلنی کرتا رہتا ہے وہاں مریض کے دل میں دنیا بھر کی تمنائیں اور اُمنگیں بھر دیتا ہے۔ مریضوں کے سرہانے ان کے ایکس رے رکھے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ آج مرض کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ سینے کے کون کون سے حصّے بے کار ہو چُکے ہیں۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوتے۔ نہ جانے زندہ رہنے کی آرزو ان کے دِلوں میں اتنی تیزی سے کیونکر بھڑک اُٹھتی ہے کہ شاید کوئی معجزہ اُنہیں بچالے۔ شاید یہ ایکس رے غلط ہوں۔ شاید یوں ہو جائے۔ شاید ووں ہو جائے۔ یہ شاید انہیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہے۔ اسی شاید کے سائے میں وہ پناہ لیتے ہیں۔ مرتے دم تک یہ غیر ممکن اُمّیدیں اور شاید پیچھا نہیں چھوڑتے۔“

”بھئی آج تم بالکل قوطی بنے ہوئے ہو؟“ ”ذ“ نے سر ہلایا۔

”تصویر کا محض تاریک رُخ ہی کیوں دیکھتے ہو جہاں سوکھے ہوئے زرد چہروں سے اتنے متاثر ہوتے ہو، وہاں دمکتے ہوئے حسین چہروں کو کیونکر نظر انداز کرتے ہو؟“

”میں نے حسین چہروں کو بھی بسترِ مرگ پر دیکھا ہے۔ میں خُدا کو مانتا ہوں۔ نیکی، بدی، جھوٹ، سچ، گناہ اور سزا۔ ان سب میں میرا عقیدہ ہے۔ جب کسی گناہ گار یا جھوٹے کو سزا ملتی ہے تو بہت خوش ہوتا ہوں لیکن کتنی ہی مرتبہ ننّھے مُنّے بچّوں کو درد سے کلبلاتے دیکھا ہے، ایسے معصوم بچّوں کو جنھوں نے ذرا سا گناہ بھی تو نہیں کیا۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ قدرت معصوم بچّوں کو کیوں تڑپاتی ہے؟ ایسے ایسے عذاب دے کر مارتی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بے گناہ کو سزا دینا انوکھی منطق ہے۔ اس پر یہ تاکید ہے کہ جو کُچھ دیکھ رہے ہو چپ چاپ دیکھتے رہو۔ خبر دار جو ایک لفظ منہ سے نکالا ہے تو۔ یہی سمجھتے ہو کہ جو کُچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہے اور قدرت کی ایک ایک ادا سہانی ہے، لاجواب ہے۔ دراصل قصور ہمارے دماغ کا ہے۔ اچھا اسے بھی چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ وبائیں کیوں آتی ہیں؟ شاید اس لیے کہ دنیا کی آبادی بہت بڑھ جاتی ہے تو توازن قائم رکھنے کے لیے انسانوں کو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں وبا سے مارا جاتا ہے۔ یا شاید وبائیں صرف گناہ گاروں کی جان لینے آتی ہیں۔ لیکن اس وقت کوئی کسی سے نہیں پوچھتا کہ تم نیک ہو یا بد؟ اس طرف سے اس طرف تک بالکل صفایا ہو جاتا ہے۔

عورتیں، مرد، نیک، بد، سب مکھیوں کی طرح مر جاتے ہیں۔ کسی جگہ عبادت ہو رہی ہے۔ لوگ خُدا کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ دفعتاً ایک مہیب زلزلہ آتا ہے اور سب کُچھ زیروزبر ہو جاتا ہے۔ مؤدبانہ جھکے ہوئے سر وہیں کچل دیئے جاتے ہیں۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی طاقت انسان سے انتقام لے رہی ہو۔ تب قدرت ہماری ذرا پروا نہیں کرتی۔ تب گناہ اور نیکی میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ آخر ہم اس قدر بے دست و پا کیوں؟ ہم اتنے لاچار و مجبور کس لیے ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ خالق سے یہ سوال پوچھوں کہ تو نے ہم پر اپنی اعلیٰ ترین صنّاعی صرف کر کے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر ہمارا مذاق کیوں اڑایا ہے؟ ہمیں قوتِ احساس بخش کر ہمارے احساسات سے اس طرح کیوں کھیلا جاتا ہے؟ ہماری جانوں کو اتنا حقیر کیوں بنایا گیا ہے؟"

"کیا کفر بک رہے ہو!" دت صاحب بولے۔ دت صاحب دراصل بزرگ پارٹی کے ممبر تھے۔ وہ کہیں پاس ہی صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"دیکھئے نا!" "ق" نے کہا۔ "اب مثلاً آپ خُدا سے محبّت کرتے ہیں۔ فرض کیا خدا بھی آپ سے محبّت کرتا اور مجھ پر کسی روز ایک عجیب سی وحشت سوار ہو جاتی ہے۔ پستول لے کر ایک گولی آپ کے سینے کے پار کر دیتا ہوں۔ آپ وہیں مر جاتے ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ کی روح اور آپ کے

خیالات کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہے تو میرے شیطانی ارادے کا۔ اور عمر بھر کی نیکیاں بھی اس وقت آپ کو بچا نہیں سکتیں۔ اگر میں مارنے پر تُل گیا ہوں اور تو آپ کو بڑی آسانی سے مار سکتا ہوں۔ اسی طرح کوئی مُجھے مار سکتا ہے۔ آپ کسی اور کو مار سکتے ہیں۔ چاقو سے کسی کی شہ رگ کاٹ دیجیے۔ جب یہ دھڑکتی ہوئی، شور مچاتی ہوئی، زندگی دم بھر میں ختم ہو جاتی ہے۔ آخر ہم اس قدر بے بس کیوں ہیں؟ یہاں تک کہ ہماری زندگی تک دوسروں کے رحم اور کرم پر منحصر ہے۔ جب چاہے کوئی راہ چلتے چلتے یہ عطیہ ہم سے چھین سکتا ہے۔ کبھی دریچے سے بازار میں انسانوں کا ہجوم دیکھتا ہوں تو عجیب عجیب خیالات میرے دِل میں آنے لگتے ہیں۔"

"بات تھی کیا اور بن کیا گئی؟" دت صاحب مُڑ کر بولے۔ "ارے بھئی ذکر تو دشمنی کا ہو رہا تھا۔"

"میں دشمنی کو بھی زیادہ وقت نہیں دیتا۔ یہ بالکل عارضی ہے۔" "ق" نے کہا، "لیکن ایک اور جذبہ ہے جو دیرپا ہے۔ رقابت کا جذبہ، یہ آگ کبھی نہیں بجھتی۔ رقابت مدّتوں قائم رہتی ہے۔ دشمنی کی کوئی اور وجہ ہو تو بیسیوں باتیں اسے دھو ڈالتی ہیں۔ معافی کے چند الفاظ ایک آدھ احسان یا پھر گزرا ہوا وقت! وقت

گہرے سے گہرے گھاؤ مندمل کر دیتا ہے لیکن رقیبوں کو کوئی کوشش آپس میں نہیں ملا سکتی۔"

"ایک طرف تو آپ زندگی کو اتنی معمولی شے سمجھتے ہیں، دوسری طرف ایک ادنیٰ سے جذبے کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔" کسی نے پوچھا۔ "میں رقابت کو اہمیت نہیں دیتا۔ اگر آپ رقابت کو مانتے ہیں تو آپ محبّت کو بھی مانتے ہوں گے اور چونکہ محبّت زندگی کا ایک حصّہ ہے لہٰذا آپ کو قائل ہونا پڑے گا کہ زندگی نہایت اہم چیز ہے۔"

"مثال کے طور پر ایک قصّہ سُناتا ہوں رقابت کے متعلق۔" "ق" نے شروع کیا۔

"ہم وہ قصّہ ضرور سنیں گے۔" کسی نے بات کاٹی۔ "لیکن اس سے پہلے میں ایک مقولہ دُہرانا چاہتا ہوں۔ کسی دانا نے کہا ہے کہ انسان سب سے بڑی حماقت اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے محدود تجربے سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرنے لگے۔"

"ق" کی مسکراہٹ بڑھ گئی۔ "اب مُجھے لیجئے، اگر میں اپنے محبوب گننے لگوں تو گنتے گنتے تھک جاؤں لیکن میں نے آج تک کسی کے متعلق کُچھ نہیں سوچا۔ میں تو

سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہوں۔ اور پھر دنیا میں محبّت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ اس سے بہتر اور ضروری امور بھی ہیں۔ دنیا میں بے شمار دلچسپیاں ہیں اور ان سب میں سے ایک محبّت ہے۔ اگر مل جائے تو غنیمت سمجھو نہ ملے تو کوئی پروا نہیں۔"

"تمہاری اور بات ہے۔ ویسے محبّت کے موضوع پر کم از کم تمہیں تو خاموش ہی رہنا چاہیے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"اس لیے کہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو چاہا ہے؟ اور میری چاہت نہایت عارضی ہوتی ہے، یہی نا؟ لیکن محبّت کون سا دائمی جذبہ ہے؟ اس میں استقلال کہاں ہے؟ ایک سخت سے لفظ سے محبّت ختم ہو جاتی ہے۔ ذرا سی غلط معنی یا شک پر پرانی سے پرانی دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ تم جو محبّت پر اس قدر بھروسہ کرتے ہو ہمیشہ اس کا سہارا لیتے ہو یہ بتاؤ اگر یہ تم سے چھین لی گئی تب کیا کرو گے؟ ممکن ہے کہ خود ہی تمہارا اس سے جی بھر جائے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کا جتنا شوق ہوتا ہے اتنی ہی جلدی اس سے جی بھر جاتا ہے۔ آج سے چند سال پہلے تمہیں اپنے کالج کے کلر جیتنے کا کتنا خبط تھا۔ ہر وقت تم اسی کوشش میں رہتے تھے اور جب تمہیں مل گیا تو کچھ عرصے کے بعد تمہیں کلر والے بلیزر سے چڑ ہو گئی۔ اپنے البموں کو لے لو کن مصیبتوں اور کسی شوق سے تم نے یہ تصویریں جمع

کی تھیں اور اب شاید تمہیں یہ بھی علم نہیں کہ یہ سارے البم کہیں پڑے ہیں۔ میں حقیقت پرست ہوں کبھی خواب نہیں دیکھتا۔ میرا عقیدہ میں ہے کہ جو کُچھ سامنے نظر آتا ہے اسی کے متعلق سوچو۔ اس سے دور مت جاؤ۔ کون جانتا ہے کہ کل آئے گا بھی یا نہیں۔ اور ماضی جو تھا وہ کبھی کا دفن ہو چکا ہے۔ میں خوب ہنس کھیل کر وقت گزارتا ہوں۔ محبّت بھی کرتا ہوں، لیکن غم نہیں لگاتا۔ مُجھے بڑھاپے کا کوئی ڈر نہیں۔ بڑھاپے میں میرے دِل میں جوانی کی ہزاروں ایسی حسین یادیں ہوں گی جن سے جی بہلا لیا کروں گا۔ اور جب اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس شان اور اطمینان سے جاؤں گا جیسے کوئی اچھی طرح سیر ہو کر دستر خوان سے اُٹھتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اسے کوئی اٹھنے کے لیے کہہ رہا ہو بلکہ اس لیے کہ اس کا جی بھر چکا ہے۔"

"کیا مصیبت ہے۔" دت صاحب اپنے سفید سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

"آخر تم لوگ ایک موضوع پر گفتگو کیوں نہیں کرتے۔"

"ق" نے سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے کہا۔ "چند روز کا ذکر ہے میں ایک ایسے شخص سے ملا جسے دیکھے کئی سال گزر چکے تھے۔ جس سے میری پرانی واقفیت تھی، اسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ بالکل اچانک ہی مل گیا۔ جی چاہا کہ اس سے خوب باتیں کروں، لیکن وہ اس قدر سرد مہری سے پیش آیا کہ میں

حیران رہ گیا۔ اس نے مُجھے ایک سرسری نگاہ سے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ میں اس کی طرف لپک ہی رہا تھا کہ میرا قدم وہیں کا وہیں رہ گیا، حالانکہ آج تک ہم کبھی نہیں لڑے تھے۔ یہاں تک کہ ہم میں کبھی نا ملائم گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی!"

"وہ کون تھا؟"

"وہ میرا رقیب تھا، آج سے چند سال پہلے کا رقیب۔ ہم دونوں ایک لڑکی کو چاہتے تھے، لیکن دونوں ناکام رہے۔ ویسے ان دِنوں میں یہی سمجھتا تھا کہ فقط مُجھے ہی پسند کیا جارہا ہے۔ اُدھر یہ بھی اِسی وہم میں مبتلا تھا۔ میں اسے بے وقوف سمجھتا تھا اور وہ مُجھے۔ مُجھے پورا یقین تھا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اُدھر وہ بھی یہی سمجھتا تھا۔ لیکن اسے یہ برتری ضرور حاصل تھی کہ وہ میدان میں مجھ سے پہلے آ چکا تھا۔ جس روز میں پہلی مرتبہ اس لڑکی کے گھر گیا تو میں نے اپنے رقیب کو دیکھا۔ وہ مُجھے دیکھتے ہی بھانپ گیا اور اسے احساس ہو گیا کہ مقابل میں کوئی آ پہنچا ہے۔ وہ معمولی شکل کا زرد رَو اور پستہ قد لڑکا تھا جس کی ہر بات میں نسوانیت تھی۔ لیکن مُجھے اُس کا حلیہ نہیں بتانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ وہ اوروں کی نظر میں بہت اچھا ہو۔ میں نے چونکہ اسے بطورِ رقیب دیکھا تھا اس لیے لازمی طور پر اس کی برائیاں ہی بیان کروں گا۔ بس اس دن سے اس کا زوال شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا وہاں آنا جانا بند ہو گیا۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس کے زوال کے ساتھ میرا

عروج شروع ہو گیا۔ نہیں، میرا حال بالکل کولہو کے بیل کا سا تھا۔ بڑی مستعدی سے اس تگ و دو میں مصروف رہا لیکن کچھ نہ ہوا۔ ہم دونوں مختلف کالجوں میں پڑھتے تھے۔ کسی سڑک پر، سینما میں یا کہیں اور اکثر آمنا سامنا ہو جاتا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو اشارہ کرتے اور نگاہیں پھیر لیتے۔ بس اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کو نہ کبھی بُرا بھلا کہا نہ ظاہر ہونے دیا کہ ہم رقیب ہیں۔ جب تک وہ وہاں رہا اسے یہ اُمّید رہی کہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور بلاوا آئے گا اور ایک مرتبہ پھر وہ اُن نگاہوں میں جگہ پائے گا جنہوں نے اسے گِرا دیا تھا۔ رقیب سے دوستی پیدا کرنا۔ یہ کتنا عجیب سا خیال ہے اور شاید یہ ممکن نہ ہو۔ لیکن کئی مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اسے دوست بناؤں۔ دیکھوں تو سہی اس کے خیالات کیا ہیں۔ اس کی باتیں کیسی ہیں۔ یہ کیسا لڑکا ہے۔ لیکن جو خلیج ہمارے درمیان تھی وہ جوں کی توں رہی۔ حتیٰ کہ میں نے سُنا کہ وہ کہیں جا رہا ہے۔ اس سے مُجھے کُچھ افسوس سا ہوا۔ پتہ نہیں مُجھے اپنے رقیب سے ہمدردی کیوں تھی۔ جب کبھی یہ سُنتا کہ وہ بیمار ہے یا پریشان ہے تو دِل چاہتا کہ کسی طرح اس کی مدد کروں لیکن وہ جھجک جو پہلے روز سے تھی ہمیشہ قائم رہی۔ جب وہ چلا گیا تو میرے لیے میدان اور بھی صاف ہو گیا۔ لیکن میں ایسا نکمّا اور بے کار ثابت ہوا کہ تین سال کی متواتر کوششوں کے باوجود ایک لڑکی کو اپنی

طرف متوجہ نہ کر سکا۔ میری ہر کوشش اُلٹی مجھ پر ہنستی تھی۔ آخر میں تنگ آ گیا۔ اپنے اوپر دِل کھول کر لعنت بھیجی، لاحول پڑھی اور وہاں سے چلا آیا۔"

"اور وہ لڑکی؟ کیا اب بھی تمہیں؟"

"نہیں! اب کُچھ نہیں رہا۔ شاید نو عمری کی محبّت ایسی ہی ہوتی ہے۔ بالکل خواب کی طرح۔ کُچھ عرصے کے بعد میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ اس نے اپنے گلابی ہونٹوں پر لپ سٹک لگا رکھی تھی۔ اپنے تمتماتے ہوئے رخساروں کو اور بھی سُرخ کر رکھا تھا۔ سیاہ کرتہ محض اس لیے پہنا گیا تھا کہ گورے رنگ پر خوب سجے۔ اب نہ اس کی مسکراہٹ میں وہ جاذبیت تھی نہ اس چہرے میں پہلی سی وہ بات تھی۔ مُجھے یہ بالکل معمولی سی لڑکی معلوم ہوئی، اور لڑکیوں جیسی۔ ایک کونے میں بیٹھ کر اسے غور سے دیکھا۔ ایک نقاد کی نگاہ سے۔ اب میری آنکھوں سے محبّت کی پٹّی اُتر چکی تھی۔ بڑی حیرت ہوئی۔ کیا یہی وہ چہرہ ہے جس پر میں مَر مٹا تھا؟ کیا خاص خوبی ہے اس میں؟ میں کسی چیز سے محبّت کرتا تھا؟ مُجھے اس لڑکی کی معصومیت پسند تھی۔ کہاں ہے وہ معصومیت؟ آخر کون سی خوبی تھی جس پر میں نثار تھا؟ شاید اپنے دماغ کی کسی تخلیق سے محبّت کرتا رہا تھا۔ اپنے تصوّر کی کسی غیر مادی شے سے۔ اور اس لڑکی کی شبیہ کو زبردستی اس معیار تک لانا چاہتا تھا۔ لیکن کبھی میں نے اسے اچھی طرح نہیں دیکھا۔ جب دیکھا اسے کرنوں سے

گھرا ہوا پایا، جن سے میری آنکھیں چندھیا جاتیں۔ اور وہ کرنیں میری تخلیق شدہ تھیں۔"

"تو کیا اب وہ محبّت ختم ہو چکی ہے؟"

"محبّت؟ میرے خیال میں مُجھے آج تک کسی سے بھی محبّت نہیں رہی۔ میں نے کبھی اس کا مزہ نہیں چکھا۔ محبّت وہ کمزور جذبہ ہرگز نہیں ہو سکتا جو میرے دِل میں بارہا آیا ہے اور ذرا سی دیر کے بعد چلا گیا۔ اس عارضی خبط کو محبّت اور حُسن کا کوئی تعلق نہیں۔ حسن پرستی اور چیز ہے اور محبّت اور چیز۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ہم حسین لڑکیوں کو اس دنیا کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان سے طرح طرح کی توقعات رکھتے ہیں۔ میں ایک اور حسین لڑکی کو بھی چاہتا تھا۔ ایک روز ہم اکٹھے چائے پی رہے تھے۔ اس نے کیک کھاتے ہوئے بڑے زور سے ڈکار لی۔ اتنے زور سے کہ سارا کمرہ گونج اُٹھا اور میرا سارا عشق وہیں بخارات بن کر اُڑ گیا۔ توبہ توبہ کتنی بدمذاقی ہے۔ ایک حسین لڑکی اور زور سے ڈکار لے! پھر ایک اور حسین لڑکی سے واسطہ پڑا۔ اس سے تو میں شادی کرتا کرتا بچ گیا۔ وہ ایک تقریب میں میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ سامنے چائے اور لوازمات تھے۔ ایک صاحب نے سِتار بجانا شروع کیا اور میں بت بن کر رہ گیا۔ اتنی عمدہ گَت میں نے کبھی نہیں سُنی تھی۔ موسیقی ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میز بالکل صاف تھی۔ وہ

حسین لڑکی سب کُچھ کھا چکی تھی۔ میری طبیعت اس قدر بیزار ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ فنکار اتنا اچھا ستار بجا رہا ہے، لوگ مبہوت بیٹھے ہیں اور ایک حسین لڑکی دونوں ہاتھوں سے بے تحاشا کھا رہی ہے۔ اچھا! ایک اور حسین خاتون تھیں جنہیں چوبیس گھنٹے مجھ سے یہی شکوہ تھا کہ میں انہیں گھورتا رہتا ہوں۔ کوئی ان سے پوچھتا کہ آپ اتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر میک اپ کس لیے کرتی ہیں۔ ایسے خوشنما لباس کیوں پہنتی ہیں۔ یہ طرح طرح کے رنگ، یہ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، یہ بناؤ سنگھار۔ آخر یہ سب کس لیے ہے؟ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ بن سنور کر نکلیں اور ہم آپ کو دیکھتے ہی اپنی آنکھیں میچ لیں یا آپ پر لاحول پڑھنے لگیں۔ گھورنا تو ایک قسم کا خراج ہے۔ کبھی کوئی بھدّے چہروں کو بھی گھورتا ہے؟ آپ خود رنگین پھُولوں اور خوشنما پرندوں کو گھورتی ہوں گی۔ کبھی آپ نے کسی اونٹ کو یا بھینس کو بھی گھورا؟ اور پھر گھورتے وقت ہمارے خیالات کسی خاص رو میں تو بہتے نہیں۔ ہم کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ خوب ہے۔ ایسا چہرہ شاید پہلے بھی دیکھا تھا۔ کہاں دیکھا تھا؟ غالباً فلاں جگہ، لیکن اس کی پیشانی کشادہ تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی حسین نہیں تھیں۔ اگر یہ لٹیں پریشان ہوتیں تو اچھا تھا۔ اب وہ لڑکی کہاں ہو گی؟ شاید اس کی شادی ہو چکی ہو۔ اور وہ جو اس کی بڑی بہن تھی وہ۔ بس اسی

طرح نہ جانے ہم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ہماری آنکھیں ایک چہرے پر جمی ہوئی ہیں اور ہم سوچ کُچھ اور رہے ہیں!"

"واقعی تم کُچھ اور سوچ رہے ہو۔" دت صاحب بولے۔ "ابھی ابھی تم کسی رقیب کا ذکر کر رہے تھے۔"

"جی ہاں! میں رقابت کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے بڑے بڑے خونخوار اور سنگدل انسان دیکھے ہیں۔ جو آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور کل نہایت گہرے دوست بن گئے۔ لیکن رقابت میں صلح ناممکن ہے۔ کُچھ ایسی اجنبیت آ جاتی ہے جو ہمیشہ رہتی ہے۔ ہاں تو چند روز ہوئے جب میں نے اپنے رقیب کو دیکھا تو اس نے فوراً آنکھیں پھیر لیں اور یہ ظاہر کیا جیسے وہ مُجھے بالکل نہیں پہچانتا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی تھا جسے میں جانتا تھا۔ جتنی دیر میں نے اس لڑکے سے باتیں کیں، تب تک رقیب نے اپنی نگاہیں مُجھ سے دُور رکھیں۔ اس کی نگاہوں میں ایسی سرد مہری تھی جو کسی شدید جذبے کو ظاہر کرتی تھی۔ اور یہ جذبہ نفرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اب میں سوچتا ہوں کہ ہماری دوستی ناممکن تھی۔ نہ ہم کبھی دوست بن سکتے تھے اور نہ کبھی بن سکیں گے، لیکن اب بھی یہ خواہش ہے کہ میں اس کی باتیں سُنوں اس کے نظریے معلوم کروں۔ بھلا یہ کیسا لڑکا ہے؟ یہ تجسس یا لگاؤ جو بھی آپ سمجھیں نہایت ہی عجیب ہے۔

میں نے سُنا تھا کہ اس لڑکے کی کسی اور جگہ منگنی ہو چکی ہے اور اب عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ شاید وہ بھی میری طرح اس لڑکی کو بھول چکا ہو گا۔ ہم دونوں اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ دونوں کو اس لڑکی نے ٹھکرا دیا اور اب دونوں اسے بھول چکے ہیں۔ ہم ایک اجنبی علاقے میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ پھر یہ بے رُخی کیسی؟ پھر اس سرد مہری کا مطلب؟ میرے خیال میں تو کوئی تلخی یا دشمنی باقی نہیں رہنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ پہلے سے زیادہ نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے وہ مُجھے دیکھ کر مُسکرایا بھی نہیں اور میں ہوں کہ نہ جانے کیوں اس کے متعلق سوچتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت رہا ہے۔ کُچھ لمحوں کے لیے اسے اس لڑکی کا قُرب بھی حاصل ہوا تھا، جس کے لیے میں ہمیشہ ترستا رہا۔ اسے اظہارِ محبّت کا موقع بھی ملا تھا اور یہ کہ وہ مجھ سے پہلے میدان میں آ چکا تھا۔ یا شاید اس لیے کہ ہم دونوں میں کوئی چیز مشترک ہے۔ کوئی جذبہ یا کوئی کمزوری! شاید اس لیے کہ میرا رازدان ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں نے بھی کیسی عجیب عجیب حرکتیں کی تھیں۔ ممکن ہے کہ صرف یہ تجسس ہو کہ میں اس کی بے رُخی کا سبب کیوں نہ دریافت کر سکا۔ آخر وہ اب تک مجھ سے نفرت کیوں کرتا ہے۔ محض رقابت ہے یا کوئی اور بات ہے۔ آپ سب دِل ہی دِل میں ہنس رہے ہوں گے کہ میں آج کس قدر بے معنی باتیں کر رہا ہوں۔ مُجھے اس لڑکی کا کوئی خیال نہیں جس کی وجہ سے یہ رقابت

شروع ہوئی، لیکن اپنے رقیب سے لگاؤ ہے جسے میری طرح ٹھکرادیا گیا جو مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے؟"

"تم نوجوانوں سے خُدا بچائے۔" دت صاحب کرسی کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے بولے۔ "اور پھر خصوصاً کنواروں سے۔ تمہاری باتیں کتنی بے ربط ہیں؟ کس قدر بے معنی ہیں؟ ان کا نہ سر ہے نہ پیر!!"

مسافر

میں دوپہر سے وہیں بیٹھا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب اِدھر اُدھر چلے گئے۔ میں کُچھ رسالے لے کر باہر دھوپ میں جا بیٹھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور سورج پوری تیزی سے چمک رہا تھا۔ پھر بھی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ پہاڑی علاقہ اس قدر سرد تھا کہ دھوپ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اِس مختصر سی آبادی میں آئے مُجھے تین مہینے ہو چکے تھے۔ ہم چار پانچ لڑکوں نے مل کر ایک چھوٹا سا میس بنا لیا جہاں ہم کھانا کھاتے اور موقع مل جاتا تو کبھی کبھار تاش کھیل لیتے یا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ وہ جگہ بالکل ویران تھی۔ چاروں طرف کئی کئی سو میل تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ بس خشک اور بنجر پہاڑ جن پر سبزہ نام تک کو نہ تھا۔ محض چٹانیں ہی چٹانیں تھیں اور کہیں کہیں ریتلا علاقہ۔ نومبر کے آخری ہفتے سے برف باری شروع ہو جاتی اور فروری مارچ تک رہتی۔ برف باری کے وقت اتنی سردی نہیں پڑتی تھی لیکن اس کے بعد جو تیز ہوا چلتی اس سے ہڈیوں کا گودا تک جم جاتا۔ بعض اوقات تو کئی دن

برف باری ہوتی اور پھر جو ہوا چلنی شروع ہوتی تو بند ہونے میں نہ آتی۔ ایسی ویران جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تنہائی سے تنگ آکر بعض دفعہ تو دِل میں ہول اُٹھنے لگتا۔ بہت جی چاہتا کوئی دوست مل جائے۔ کسی اجنبی سے علیک سلیک ہو جائے یا کوئی مسافر نظر آ جائے جس سے دو چار باتیں کر لیں۔ ہمیں باہر دورے پر بھی جانا پڑتا، موٹر میں یا پیدل۔ خواہ کتنی دور چلے جاتے سیاہ چٹانوں اور صحراؤں کے سوا کُچھ بھی نظر نہ آتا۔

کام کے اوقات ایسے تھے کہ ایک دوسرے سے ملنے کا موقع بھی کبھار ہی ملتا۔ ہمارے کام بھی مختلف تھے۔ اکثر یہی ہوتا کہ ایک آیا کُچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ دوسرا آیا، وہ بھی چلا گیا۔ اسی طرح ہم کھانا اکثر اکیلے کھاتے اور تنہا ہی بیٹھے رہتے۔

ہم لڑکوں کے علاوہ میس کے ایک اور بھی ممبر تھے، انجنیئر صاحب۔ جو مہینے میں فقط دو چار دِنوں کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کا کام ہم سب سے زیادہ تھا اور وہ ہر وقت دوروں پر رہتے۔ اتنے طویل و عریض علاقے میں کہ ہمیں تعجب ہوتا تھا کہ وہ اس قدر کام کس طرح کر لیتے ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ درمیانہ قد، دوہرا جسم، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی، سر کے بال بالکل سفید

تھے۔ چہرے پر ہمیشہ کچھ ایسی اداسی چھائی رہی جس میں شفقت اور محبّت کی جھلک بھی ہوتی۔

اس عمر میں انہیں اتنی سخت محنت کرتے دیکھ کر مُجھے ترس آ جاتا۔ سب لڑکے انہیں مسافر کہا کرتے۔ شاید کسی کو ان کا اصلی نام معلوم نہیں تھا۔ اور وہ تھے بھی بالکل مسافر۔ آج یہاں ہیں، کل یہاں سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر، پرسوں ڈیڑھ دو سو میل دور۔ نہ ہم نے ان کے نام کوئی خط آتا دیکھا نہ ہی غالباً وہ کسی کو خط لکھتے ہوں گئے۔

میں دوپہر سے باہر پلاٹ میں بیٹھا تھا۔ کُچھ رسالے میری گود میں پڑے تھے اور کچھ گھاس پر۔ نہ پڑھنے کو جی چاہتا تھا اور نہ سوچنے کو۔ سوچنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ دن ڈھل چکا تھا اور خنکی بڑھتی جارہی تھی۔

چاروں طرف سوکھے ہوئے درخت کھڑے تھے جن کے پتے اور ٹہنیاں برف نے جلادی تھیں۔

اتنی شدّت کی برف باری صرف وہیں دیکھی۔ جس روز برف پڑنی ہوتی تو پہلے آسمان پر گھٹایوں پھیل جاتی جیسے گہری دُھند چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد ہلکی ہلکی بوندیں پڑتیں۔ پھر ننّھے مُنّے سفید گالے گرنے لگتے۔ بالکل روئی کے گالوں کے

سے! یہ گالے بڑے ہوتے جاتے۔ دیکھتے دیکھتے مکان، درخت، سڑکیں، تاروں کے کھمبے سب سفید ہو جاتے۔ چاروں طرف برف ہی برف دکھائی دیتی۔ وہاں جو چند گنے گنائے آدمی رہتے تھے۔ برفباری کے بعد وہ بھی گھروں میں دُبک جاتے اور چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔

وہاں کئی خوبصورت نظارے بھی دیکھنے میں آئے۔ ایک دفعہ برف پڑ رہی تھی یکایک بادل چھٹا اور چاند جھانکنے لگا۔ چاندنی میں برف باری۔ ایسا نظارہ تھا جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ پھر ایک مرتبہ ساری رات برف پڑتی رہی۔ علی الصبح یک لخت گھٹا صاف ہو گئی اور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں سے سورج طلوع ہوا۔ اتنے شوخ رنگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ طرح طرح کے تلملاتے ہوئے، مچلتے رنگ آنکھیں خیرہ کر دینے والے۔ قوسِ قزح کے ساتوں رنگ نت نئے انداز میں۔ اور پھر دھوپ میں برف اس قدر چمکنے لگی کہ سیاہ عینک لگانی پڑی۔

سامنے پہاڑیوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق سے آسمان کا وہ حصّہ جگمگانے لگا۔ میری نگاہیں ایک انسانی سائے پر جم گئیں جو متحرک تھا۔ پہاڑ سے جو پیچیدہ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی نیچے اترتی تھی اس پر کوئی آرہا تھا۔ کوئی مسافر۔

ایک مسافر کو آتے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ یہ بالکل قریب آگیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا اور سردی بڑھتی جارہی تھی۔ لیکن میں اس مسافر کا منتظر تھا۔

ارے! یہ تو انجنیئر صاحب تھے، جنہیں ہم مسافر کہا کرتے۔ یہ کہاں سے آرہے ہیں؟ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے بڑے ملائم لہجے میں جواب دیا۔ وہ دھول میں اَٹے ہوئے تھے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا اور تھکاوٹ سے جھُریاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ ہم انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئے۔ مُجھے پہلی مرتبہ ان سے اچھی طرح باتیں کرنے کا موقع ملا۔ دِل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ یہ ایسا علاقہ اور اتنی مشقت کیوں پسند کرتے ہیں؟ اس عمر میں اس طرح کی زندگی انہیں کیونکر راس آتی ہو گی؟ ان کے بال بچّے بھی تو ہوں گے۔ شاید مُجھے جتنے تو ان کے لڑکے ہوں، لیکن ان کے خط کیوں نہیں آتے؟ ان کے عزیز انہیں یاد کیوں نہیں کرتے؟

ان کی آنکھوں میں بڑی شفقت تھی جو چہرے کی اداسی کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔ چہرے پر یہ شان جو بزرگوں کے چہروں پر ہوتی ہے اور وہ جلال بھی جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے۔ ان کی ایک اور خوبی جو بہت پسند آئی یہ تھی کہ وہ کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ ان کی گفتگو اس قدر سادہ اور خیالات اتنے سلجھے

ہوئے تھے کہ میں بہت متاثر ہوا۔ وہ صبح سے بھوکے تھے۔ دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر چلے لیکن راستے میں کوئی مسافر مل گیا جو بھوکا تھا۔ یہ اپنا کھانا اسے دے آئے۔

"اس کی عمر کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی تیس پینتیس برس کا ہوگا۔"

"وہ آپ سے کہیں چھوٹا تھا اور بھوک برداشت کر سکتا تھا۔"

"لیکن وہ زیادہ بھوکا تھا۔ میں ناشتہ کر کے چلا تھا اور اسے کوئی ناشتہ نہیں ملا۔ اگر میں اسے کھانا نہ دیتا تو کئی دنوں تک یہ پچھتاوا میرے دِل میں رہتا۔ تم کبھی بھوکے رہے ہو؟"

"نہیں! سوائے روزوں کے میں کبھی بھوکا نہیں رہا!"

"روزوں کی بھوک تو مقابلۃً معمولی ہوتی ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اصلی بھوک کتنی ظالم ہو سکتی ہے۔ اور اگر بھوک کے ساتھ ساتھ بہت سے فکر بھی ہوں تب تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا ہے۔ مُجھے اس کا ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے۔ کبھی کوئی بے کس کہیں نظر آئے تو ضرور کُچھ نہ کُچھ دے دیا کرو۔ اگر تم چھپ کر دیکھ سکو تو ضرور دیکھنا کہ تمہارے ایک پیسے یا ایک آنے کا

اس پر کیا اثر ہوتا ہے؟ وہ حقیر سی رقم جو تمہارے کسی مصرف کی نہیں ایک غریب کو کتنی ڈھارس پہنچاتی ہے اور پھر انسان ضرورت کے وقت انسانوں ہی کے منتظر رہتے ہیں۔ انسان ہی انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ کبھی کوئی فرشتہ آ کر اس کا ہاتھ نہیں تھام لیتا۔ اور بعض لوگ تو روپے پیسے بھی نہیں مانگتے۔ وہ صرف تسلّی کا ایک لفظ یا ذرا ہمدردی چاہتے ہیں۔ کسی غمگین اور پژمردہ شخص کو تنہائی میں بیٹھا دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ چند محبّت بھرے الفاظ کا طالب ہے۔ تم ذرا پیار سے بول لیے تو اس کا دکھ درد کم ہو جائے گا۔ دنیا میں مشکل ہی سے کوئی دِل ایسا ہو گا جسے ہمدردی کی ضرورت نہ ہو۔ اور شفقت اسی کی ہے جس سے ہر دِل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی مہربانیاں اور ہمدردیاں ہیں جن کی توقع ہمارے ساتھی انسان ہم سے رکھتے ہیں۔ اگر تم سال بھر میں دو تین مرتبہ بھی بڑی رقمیں مدد کے طور پر دیتے ہو یا ایک دو چندے کہیں بھیجتے ہو، ان سے کہیں بہتر وہ چھوٹی موٹی نیکیاں ہیں جو ہمیں ہر روز کرنی چاہئیں۔“

کھانا تیار تھا۔ ہم میز کے گرد جا بیٹھے۔ کُچھ دیر کے بعد قسمت پر باتیں ہونے لگیں۔ میرا خیال تھا کہ یہاں سب کُچھ مقررہ ہے جو خوش قسمت ہے اس کی تقدیر کبھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن ان کا نظریہ مخالف تھا۔ وہ بولے۔ ”ہم سب انسان تقریباً ایک جیسے ہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیان جتنی مخلوق سانس لیتی ہے ان میں ایک حد تک یکسانیت ہے۔ ہم سب غلطیاں کرتے ہیں۔ ہم سب

میں خوبیاں ہیں۔ سب میں کمزوریاں بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی میں قدرے زیادہ ہیں اور کسی میں ذرا کم اور یہی ذرا سا فرق ہماری کمزور آنکھوں کو بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح تقدیر بھی ہے۔ ہم سب خوش قسمت بھی ہیں اور بدقسمت بھی۔ ہمیں ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے اور تصویر کا کون سا رُخ ہمیں پسند ہے اس کا انحصار خود ہم پر ہے۔"

ان کی سیدھی سادی گفتگو مُجھے اس قدر پسند آئی کہ دیر تک سُنتا رہا۔ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

جب ہم باہر نکلے تو سخت سردی تھی۔ وہ اوورکوٹ اپنے سامان میں چھوڑ آئے تھے جو ان کے عملے کے پاس تھا۔ میں نے اپنا اوورکوٹ دینا چاہا وہ نہ مانے۔ میں نے اصرار کیا اور بڑی مشکل سے انہیں پہنایا۔ مُجھے ڈر تھا کہ کہیں انہیں سردی نہ لگ جائے۔ میں انہیں ان کے کیمپ تک چھوڑنے گیا۔

اگلے روز جب کام پر جا رہا تھا تو وہ راستے میں ملے۔ وہ صبح کی سیر سے واپس آ رہے تھے اور ان کے ہاتھ میں پھُول تھا جو انہوں نے مُجھے دیا۔

اس ویرانے میں یہ پہلا پھُول ہے جسے اس موسم میں دیکھا ہے۔ شاید بہار آنے والی ہے۔

"اسے تمہارے لیے لایا ہوں۔"

مدّت کے بعد ایک مُسکراتا ہوا شگفتہ پھُول دیکھا۔ مجُھے سادہ سا تحفہ بہت پسند آیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا۔

دوپہر کو کھانے پر جب وہ آئے تو آواز بھاری تھی۔ شاید انہیں سردی لگ گئی تھی۔ کُچھ روز علیل رہے اور مجُھے تیمارداری کا موقع مل گیا۔ اس دوران میں انہوں نے بڑی اچھی باتیں سنائیں۔ ان کی گزشتہ زندگی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ایک دو مرتبہ کوشش بھی کی لیکن دریافت کرنے کی ہمّت نہ پڑی۔

انہوں نے اپنی موجودہ زندگی کے متعلق بہت کُچھ بتایا۔ انہیں کافی تنخواہ ملتی تھی۔ اس ویران علاقے میں دو سال سے تھے لیکن ان کے پاس ایک پائی بھی جمع نہیں تھی۔ اپنی ساری تنخواہ مزدوروں اور ضرورت مندوں میں بانٹ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں اپنے خرچ کے لیے قرض لینا پڑتا۔

"اور جب میں روپے بانٹتا ہوں تو میرا دِل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ دنیا میں بے شمار مسرتیں ہیں، لیکن سب سے بڑی مسرت وہ ہے جو کسی کی مدد کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔"

انہوں نے میری لگاتار خاموشی کا سبب پوچھا اور میں نے بیسیوں وجوہات گنوا دیں۔ تمنائی، بیزاری، اداسی، یہ اور وہ۔

''شاید تم اُمّید کھو بیٹھے ہو، کیوں؟''

اور میں نے سر ہلا دیا۔

''اُمّید ترک کر دینا گناہ ہے، کیونکہ اُمّید بذاتِ خود ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ بہت بڑا تحفہ ہے۔ اُمّید سورج کی طرح ہے جس کی طرف چلنے لگیں تو ہمارے رنج و غم سائے کی طرح پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس سے ہماری خوشیاں دگنی اور غم آدھے ہو جاتے ہیں۔

اور مایوسی تو گناہ ہے، کیونکہ مایوس ہو کر تم دوسروں کو بھی مایوس کر دیتے ہو۔

اس کے جراثیم بڑے مہلک ہوتے ہیں، محزون چہرہ دیکھ کر دوسرے کے دِل میں افسردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مُسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ خواہ خواہ مُسکرانے لگتے ہیں۔ سورج کو دیکھو جب طلوع ہوتا ہے تو کیسی کیسی مسرتیں تقسیم کرتا ہے۔ اگر کسی طرح مسرور نہیں رہ سکتے تو خوش رہنے کو اپنی ڈیوٹی ہی سمجھ لو کہ جی چاہے یا نہ چاہے بس مسرور رہنا ہے۔ اور اُمّید کو کبھی نہ چھوڑو۔ اگر تمہیں خدا پر بھروسہ ہے تو اُمّید پر بھی ہونا چاہیے کیونکہ

اُمّید خُدا کا عطیہ ہے اور ہم فانی انسانوں کے پاس سب سے بڑا سرمایہ اُمّید ہی ہے۔"

ہم دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ یہ اور ایسے اور سبق آج تک کسی نے نہیں دیئے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں جیسے روح میں سما جائیں۔ ہر صبح وہ میرے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ لاتے تھے جس سے اتنی خوشی ہوتی تھی کہ دن بھر مسرور رہتا۔

ایک روز انہوں نے بتایا کہ وہ جا رہے ہیں۔ ان کا عملہ رات کو چل دے گا اور وہ علی الصبح جائیں گے۔ راستے خراب تھے، اس لیے انہیں دو روز پیدل چلنے کے بعد لاری مل سکے گی۔

وہ پہلی مرتبہ کُچھ روز میس میں ٹھہرے تھے۔ یہ ان کا سب سے طویل قیام تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم انگیٹھی کے سامنے بیٹھ گئے۔

"پھر کب ملاقات ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کب ملاقات ہو کیونکہ میرا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے اور میں بہت دور جا رہا ہوں۔ تم سے مل کر واقعی خوش ہوئی۔ تم مجھ پر بے حد مہربان رہے ہو۔

میں ان چند دنوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر تم اتنا خیال نہ رکھتے تو میں اتنی جلدی کبھی اچھا نہ ہوتا۔"

میں مغموم ہو گیا۔ ان کے جانے پر رنج ہو رہا تھا۔ تب میں نے یکایک پوچھ لیا ان کی گزشتہ زندگی کے متعلق۔ کہ انہیں ایسی ملازمت کیوں پسند ہے؟ اس عمر میں وہ کس لیے یوں مارے مارے پھر رہے ہیں؟ ان کے نام کوئی خط کیوں نہیں آتا؟ وہ اپنے مستقبل کے لیے روپیہ کیوں نہیں جمع کرتے؟

اور انہوں نے اپنی زندگی کی داستاں سنائی۔ یہ بمبئ میں ایک ادارے کے صدر تھے۔ بڑی باعزّت ملازمت تھی۔ ساری آسائشیں میسر تھیں۔ پھر یکایک ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور جب ان کا انتقال ہوا تو میں باہر تھا۔ بمبئ سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر۔ خبر سُنتے ہی فوراً واپس پہنچا اور میں نے دیکھا کہ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ نہ وہ بیمار ہوئیں، نہ انہیں کوئی تکلیف ہوئی۔ بس دیکھتے دیکھتے پل بھر میں جان دے دی۔ جتنی پُر سکون ان کی زندگی تھی اتنی ہی پُر سکون ان کی موت تھی۔ لیکن مجُھے ایک بات کا پچھتاوا رہ گیا۔ کاش کہ میں اس وقت ان کے پاس ہوتا۔ اگرچہ یہی خیال صحیح نہیں کہ میں وہاں ہوتا تو شاید انہیں مرنے نہ دیتا۔ کُچھ ہماری محبّت ہی ایسی تھی۔ ان کی موت کے بعد میں کُچھ دنوں تو بے حد غمگین رہا پھر جیسے دِل خود بخود سنبھل گیا، لیکن مجُھے اس گھر سے

نفرت ہو گئی۔ ان کمروں سے، اس سامان آرائش سے، یہاں تک کہ اس سڑک سے نفرت ہو گئی جس پر ہماری کوٹھی تھی اور یہ نفرت اس قدر بڑھ گئی کہ تنگ آ کر مکان بدل دیا۔ اب مُجھے اپنی ملازمت بری معلوم ہونے لگی۔ وہاں میرا جی نہ لگتا۔ یہ ادارہ، اپنا کام، ہر چیز بُری لگتی تھی۔ مُجھے بمبئ سے نفرت ہو گئی اور بمبئ کے گرد و نواح سے بھی جہاں ہم دونوں اکثر گھوما کرتے تھے۔ وہاں کی ہر چیز کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ میں نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور ایک گاؤں میں چلا گیا۔ یہ میرا کوئی بچّہ تھا نہ کوئی قریبی رشتہ دار۔ میری ساری محبّت اپنی بیوی کے لیے وقف تھی جو مُجھے تنہا چھوڑ کر سدھار چکی تھی اور اب انہیں کھو کر میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اپنی منزل تک کا علم نہ تھا، راستے کا کیا پتہ ہوتا۔ وہ گاؤں بمبئ کے نزدیک ہی تھا۔ وہاں بمبئ کا ذکر ہوتا رہتا۔ بمبئ کی گاڑیاں وہاں سے گزرتی تھیں۔ وہاں بھی میرا جی نہ لگا۔ آخر میں وہاں سے بہت دُور چلا آیا۔ کسی نے مشورہ دیا اور میں نے یہ ملازمت قبول کر لی۔ اب مُجھے کہیں بھی بھیج دیا جائے، کام کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، بس میں بمبئ نہیں جانا چاہتا۔ وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔

کُچھ دیر خاموشی رہی۔ سوائے شعلوں کی آواز کے جو انگیٹھی میں مچل رہے تھے۔

"اور اب ان بازوؤں میں طاقت باقی نہیں رہی۔ میرے قدم بعض اوقات جواب دے دیتے ہیں۔ اس جسم میں وہ دم خم نہیں رہا۔ سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ بوڑھا دکھائی دیتا ہوں، لیکن انہیں مجھ پر ناز تھا۔ انہیں میری ہمّت اور دلیری پر فخر تھا اور اب جب بھی تھک ہار کر کہیں پناہ لینا چاہتا ہوں تو اچانک ان کی یاد آ جاتی ہے۔ اگر ان کی روح کہیں مُجھے دیکھ رہی ہو تب؟ بس یہ خیال ہے جس پر میں زندہ ہوں۔ میں انہیں خواب میں بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اگر کسی روز کوئی بہت اچھا کام کریں تو وہ مسرور نظر آتی ہیں۔ جن دنوں میں بے حد غمگین تھا۔ کئی لوگوں نے شراب کا مشورہ دیا لیکن شراب تو ایک طرف میں سگریٹ تک نہیں پیتا کیونکہ انہیں ان دونوں سے نفرت تھی۔ میں ہر وقت مسرور رہتا ہوں۔ یہی کوشش رہتی ہے کہ دوسرے بھی مسکرانے لگیں۔ انہیں مُسکراتی ہوئی چیزیں پسند تھیں۔ وہ خود ہمیشہ خوش رہتی تھیں۔ بے کسوں کی مدد، دوسروں کا غم بانٹنا، انسانی ہمدردی۔ یہ سب باتیں انہوں نے مُجھے سکھائی تھیں۔"

"لیکن آپ کا کام بہت زیادہ ہے۔ یہ ملازمت آپ کے لیے بہت سخت ہے؟"

"میں مانتا ہوں لیکن زندگی کا سفر بھی تو کسی نہ کسی طرح طے کرنا ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمت ہار کر بیٹھ جانا بزدلی ہے۔ اور گھسٹنے یا لڑکھڑانے سے سفر ہرگز کم نہ ہوگا بلکہ اور مشکل ہو جائے گا۔"

اس رات سخت برف باری ہوئی۔ برف کے بڑے بڑے گالے تیزی سے گرتے رہے۔ رات بھر میں ان کے متعلق سوچتا رہا۔ دفعتہً مُجھے خیال آیا کہ انہوں نے اپنے ناشتے کا انتظام نہیں کیا تھا۔ اُٹھا اور جو کُچھ مل سکا اکٹھا کیا۔ ناشتہ تیار کر کے ایک تھیلے میں بند کیا۔ صبح پانچ بجے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ البتہ برف کی چمک سے مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔

پورے چھ بجے میں نے انہیں جاتے دیکھا۔ وہ اپنے سیاہ لبادے میں لپٹے ہوئے تھے۔ دوڑ کر ان سے ملا۔ ناشتے کا تھیلا انہیں دیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

میں کُچھ اور ان کے ساتھ گیا جہاں سے چڑھائی شروع ہوئی تھی، وہاں انہوں نے مجھ سے واپسی کے لیے کہا۔

انہوں نے شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ مُجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔

آسمان سے برف کے بڑے گالے پڑ رہے تھے۔ خون منجمد کر دینے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ اس اُجلے ماحول میں ان کا سیاہ لبادہ دور تک نظر آتا تھا۔

اور میں دیر تک اس مسافر کو دیکھتا رہا جو زندگی کے راستے کو نہایت دلیری سے طے کر رہا تھا۔

مدّ وجزر

میں پورے آٹھ سال کے بعد وہ حدود عبور کر رہا تھا، وہی حدود۔ جہاں سے کبھی بے حد غمگین گزرا تھا۔ لیکن اب مُسکراتا ہوا آ رہا تھا اور ان آٹھ سالوں نے ایک ناتجربہ کار لڑکے کو جہاں دیدہ اور ناپختہ کار انسان بنا دیا تھا۔ میں نے اجنبی ملک دیکھے تھے۔ نئے نئے تجربے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی باتیں سیکھی تھیں۔ اب جیسے ایک نئی دنیا میں سانس لے رہا تھا جو پہلی دنیا سے بالکل مختلف تھی۔

ٹرین کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے اسٹیشنوں کو دیکھا۔ پہاڑوں کو، پلوں کو، سرنگوں کو۔ مُجھے ایک ایک چیز یاد تھی۔ ان سب کا نقشہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ مخصوص شکل کی چوٹیاں، بل کھاتی ہوئی ندیاں، وہ جنگل، سب کُچھ وہی تھا۔ بالکل وہی جو آج سے آٹھ سال پہلے تھا لیکن اب حالات کس قدر مختلف تھے۔ تب میں زندگی سے بیزار تھا۔ دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن اب شگفتگی ہے، جولانی ہے۔ یوں لگتا ہے

جیسے سورج فقط میرے ہی لیے چمکتا ہے۔ پھول محض میرے ہی لیے مسکراتے ہیں۔ ستارے محض میرے ہی لیے جگمگاتے ہیں اور دن رات کا یہ عجیب کھیل نور و ظلمت کا امتزاج یہ صرف میرے ہی لیے ہے۔ یہ دنیا نہ تو غم کدہ ہے اور نہ ہی راحت کدہ۔ نہ یہاں رنج بٹتے ہیں اور نہ خوشیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ نہ ہی ایک عذاب ہے اور نہ دلکش سپنا۔ یہ تو ایک خلا ہے ایک وسیع خلا، اور ہمارا دِل نور کا منبع ہے۔ اس کی جلا سے روح روشن ہے، اس سے آنکھوں میں تر و تازگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ جب تک یہ شمع جلتی رہتی ہے ساری دنیا منوّر اور مسرور نظر آتی ہے اور جس روز یہ شمع بجھ جائے تو چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ کُچھ بھی نظر نہیں آتا۔ تب قدرت کا کھیل کتنا بے معنی اور بے رنگ و بو لگتا ہے۔

میرے دِل کی شمع جسے محبّت کی شدید ناکامی نے ایک مرتبہ بجھا دیا تھا اسے میں نے خود روشن کر لیا۔

میں مُسکرانے لگا۔ لڑکپن میں کیسی کیسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں؟ مُجھے ثریّا سے کس قدر محبّت تھی۔ اسے کس قدر چاہتا تھا لیکن جب انتخاب کا وقت آیا تو ثریّا نے اپنے پرانے رفیق کو چھوڑ کر کسی احمد کو چن لیا۔ اس کو جو بالکل نووارد تھا،

جس سے محض چند ہفتوں کی واقفیت تھی اور جس میں کوئی خاص خوبی بھی نہیں تھی۔ پتہ نہیں ثریّا نے ایسا کیوں کیا۔

اتنے قلیل عرصے میں وہ ثریّا کو اتنا بھایا کہ وہ میری طویل رفاقت بھول گئی۔

محبّت بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ بالکل طوفان کی طرح۔ ابھی تند و تیز ہے ابھی رُخ پلٹا اور سکون ہی سکون ہے۔ جیسے کبھی کُچھ تھا ہی نہیں۔ محبّت کتی غیر یقینی شے ہے جیسے ہوا کا رخ ہو نہ جانے کب بدل جائے۔

اور مُجھے کس قدر رنج ہوا تھا۔ کتنے دنوں تک کھویا کھویا سا رہا۔ نہ دن کی خبر رہی نہ رات کی۔ آخر ناامید ہو کر باہر نکل گیا اور یہ تبدیلی میرے لیے بہتر ثابت ہوئی۔ اگر ثریّا مُجھے چن لیتی تھی تو اب تک شاید میں ایک گھریلو اور چڑچڑا شخص بن جاتا جو شاید زندگی کی یکسانیت سے تنگ آ چکا ہوتا۔ ایک ہی جگہ رہ رہ کر ایک ہی قسم کی باتیں سُن سُن کر کبھی اکتا چکا ہوتا۔

اس طویل عرصے میں میں نے مصیبتوں پر قہقہے لگائے تھے۔ زندگی کی ظلمتوں میں مایوس کُن حالات اور بھاری غموں میں بھی میرا سر بھی نہ جھکا نہ ہی میں نے کسی کو مدد کے لیے پکارا۔

میں واقعی بدل چکا ہوں۔ اگر کہیں احمد مُجھے مل جائے تو اس کا شکریہ ادا کروں گا۔ اگر وہ نہ آتا تو نہ میں ٹھکرایا جاتا اور نہ ہی خوشگوار تبدیلیاں زندگی میں آتیں۔

میں نے گھڑی دیکھی، پورے پانچ گھنٹوں کے بعد گھر پہنچ جاؤں گا۔

عزیزوں سے ملاقات کس قدر خوشگوار ہو گی، اتنے طویل عرصے کے بعد۔

آج دسمبر کی اکتیس تاریخ ہے۔ کل نئے سال کا نیا دن طلوع ہو گا۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور کش لگانے لگا۔

اور ایک جنکشن پر سچ مچ احمد مل گیا۔ پہلے تو یقین ہی نہ آتا تھا۔ دیکھتے ہی چمٹ گیا اور مُجھے ٹرین سے اتار لیا۔ کہنے لگا کُچھ روز ٹھہرو۔ میں نے معذرت کی تو مجبور کرنے لگا۔ میری ایک نہ چلی اور طے ہوا کہ کم از کم ایک دن تو ضرور ٹھہر جاؤں اور کل صبح کی ٹرین سے چلا جاؤں۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پہلے سے کتنا تبدیل ہو گیا تھا۔ عینک لگ گئی تھی۔ چہرے پر جھُریاں پڑ گئی تھیں، جسم ڈھیلا ہو گیا تھا۔

”ثریّا سے بھی مل لوگے۔“ وہ بولا۔ ”بھلے آدمی صدیاں گزر گئیں لیکن کُچھ بھی تو پتہ نہ چل سکا تمہارا۔ رنج تو واقعی تمہیں بہت ہوا تھا، لیکن ایسا بھی کیا زندگی سے بیزار ہو کر خانہ بدوشی شروع کر دی۔“ اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

اس کے گھر پہنچے۔ وہاں ثریّا ملی۔ بالکل ویسی ہی حسین، اتنی ہی پیاری۔ اتنے طویل عرصے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

احمد کہنے لگا: ”تم کبھی دِل ہی دِل میں شاید کڑھا کرتی تھیں کہ ان صاحب کو کتنا رنج ہوا ہو گا۔ یہ دیکھ لو۔ کیسی مُسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی ہے۔ قسم لے لو جو اتنا سا بھی غم لگا یا ہو۔“

چائے کا دور چل رہا تھا۔ پرانی باتوں پر قہقہے لگ رہے تھے۔ کتنی دیر ہم یونہی بیٹھے رہے۔ پھر احمد کو کہیں سے بلاوا آیا وہ کُچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا۔

اب ثریّا مُسکرا کر بولی: ”بیگم کہاں ہیں؟“

”کس کی بیگم؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہاری۔“

”نہیں! مُجھے اپنے ساتھ ہمدردی ہے۔“ میں نے شوخی سے کہا۔ ”بیگم کہیں بھی نہیں۔“

”کیوں؟ شادی کیوں نہیں کی؟“

”یونہی؟“

"کس لیے آخر؟"

میں چپ رہا۔

میں نے باتوں کا رُخ پلٹ دیا اور سیاحت کی باتیں شروع کر دیں۔ طرح طرح کے قصّے سُنا رہا تھا۔ لیکن میں اکیلا ہی ہنس رہا تھا۔ ثریّا ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گے؟"

"پھر کبھی کوئی لڑکی اچھی لگی؟"

"نہیں!"

"جھوٹ!"

"سچ! خُدا کی قسم، تمہاری قسم!"

"کیوں؟ بس یونہی۔"

وہ میری جانب دیکھ رہی تھی۔ عجیب سی نگاہوں سے۔ خوابیدہ سی، حسرت بھری، غمناک نگاہیں۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی اور خبر نہ رہی کہ کہاں ہوں۔ بس میں دو پُر فسوں آنکھوں کے سامنے مسحور بیٹھا تھا۔ ثریّا باتیں کر رہی

مدّ و جزر

تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”کیا اپنا بچپن یاد ہے؟ اپنا اور میرا؟ وہ پرانی رفاقت بھی یاد ہے؟ کیا تمہیں اس ہرے بھرے باغ کا وہ خوبصورت گوشہ یاد ہے جہاں سُرخ رنگ کے کمرے تھے۔ ہمارے کمرے۔ دیواروں پر رنگ برنگی تصویریں تھیں۔ چھت سے طرح طرح کے غبارے آویزاں تھے اور میزوں پر پریوں کی کہانیوں کی کتابیں، کھلونے اور رنگین لیمپ رکھے تھے۔ کیا وہ سفید اُجلے پھُولوں والا پودا بھی یاد ہے جو ایک دریچے سے اندر جھانکا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات تو ہوا کے جھونکوں سے اس کی ٹہنیاں جھوم جھوم کر بالکل اندر آجایا کرتی تھیں۔ اس کی ٹہنیوں میں کتنے پھُول کھلتے تھے اور جب رات کو چاند اس دریچے کے پاس سے گزرتا تو اکثر اسی پودے کی خاردار ٹہنیوں سے الجھ جاتا اور دیر کے بعد نکلتا۔ ہم دونوں کی اکٹھی تصویریں اب تک رکھی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کا کتنا خیال تھا۔ کبھی ایک دفعہ بھی تو نہیں لڑے۔ نہ کبھی کوئی رنجش ہوئی۔ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ پڑوس میں رہنے والے انگریز اور اس کی بیوی کو تو نہیں بھولے ہو گئے۔ وہ ہم سے کس قدر محبّت کرتے تھے۔ آس پاس اور کتنے سارے بچے رہتے تھے لیکن انہیں صرف ہم دونوں ہی اچھے لگتے۔ اور وہ بادل بھی یاد ہیں جو چپکے سے ہمارے کمروں میں چلے آتے۔ جب اُجلے اُجلے بادل دوڑتے ہوئے سرو کے درختوں کے اوپر سے گزرنے لگتے تو ہم جلدی سے سب دریچے بند کر لیا کرتے لیکن بادل پھر بھی اندر آجاتے اور دھواں ہی دھواں ہو جاتا۔ کیا تمہیں

وہ شہد کی مکھیاں بھی یاد ہیں جو پھُولوں کے تختوں پر بھنبھنایا کرتیں۔ اونچے درختوں میں ان کے بڑے بڑے چھتے تھے۔ وہ جھیل تو نہیں بھولی ہو گی جو پرے پہاڑوں میں تھی۔ کتنی منتوں کے بعد ہمیں وہاں کشتی کی سیر کی اجازت ملی تھی۔ انّا ہمارے ساتھ تھی۔ ذرا دیر پہلے بارش ہوئی تھی اور ہوا کے خنک جھونکوں سے ہم ٹھٹھر رہے تھے۔ لیکن کشتی کی سیر کا شوق بے انتہا تھا اور جب ہم جھیل کے وسط میں پہنچے تو یکایک ایک قوسِ قزح درختوں کے جھنڈ سے نکلی۔ آسمان کو طے کرتی ہوئی پہاڑیوں تک چلی گئی اور جھیل پر ایک رنگین پل بنا دیا۔ تمہیں وہ قوسِ قزح بھی یاد ہے جو بارش کے بعد ہمارے باغ کے اوپر چھا جایا کرتی۔ ایک مرتبہ ہم قوسِ قزح کے دوسرے سِرے کی تلاش میں نکلے تھے جو چنار کے درختوں کے اوپر تھا لیکن اتنے میں بادل چھٹ گئے۔ سورج نکل آیا اور قوسِ قزح غائب ہو گئی۔

تمہیں وہ بوڑھی انّا بھی یاد ہو گی۔ وہی پُر شفقت انّا جس کا دِل سونے کا تھا جو ساری ساری رات ہمیں پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ جب کبھی تمہاری امّی ڈانٹتیں یا مُجھے شرارتوں پر دھمکایا جاتا تو ہم رونی صورتیں بنا کر دریچوں میں بیٹھ جاتے۔ تب ہمیں سب بزرگوں پر کتنا غصّہ آیا کرتا۔ اس وقت ہماری محبوب انّا ہماری غم خوار ہوتی تھی۔ وہی آ کر ہمیں ہنساتی، گُدگُدیاں کرتی۔ کیا تم اس کی لوریاں بھول گئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گیت جو اس کے سادے اور پُر خلوص دِل

سے نکلتے تھے۔ ہم غصّے میں آ کر نہ جانے اسے کیا کیا کہہ جاتے لیکن وہ کبھی برا نہ مانتی۔ اس کا بھولا بھالا نورانی چہرہ ہمیشہ جگمگاتا رہتا۔ اب وہ دوسری دنیا میں ہے۔ مرتے وقت اس نے تمہیں بہت یاد کیا۔ تمہیں دیکھنے کے لیے وہ بہت بے قرار رہی۔ بار بار ہمیں پوچھتی رہی کہ تم کہاں ہو؟ تمہارا کوئی خط نہیں آیا؟ وہ رنگین اور شوخ تتلیاں بھی یاد ہیں جو دریچوں سے اُڑتی ہوئی کمرے میں آ جاتی تھیں۔ وہ سیٹیاں بجانے والے پرندے تو نہ بھولے ہوں گے جن کے کئی پنجرے دالان میں آویزاں تھے۔ تم انہیں طرح طرح کی سریلی سیٹیاں ہر روز سکھایا کرتے تھے۔ اور وہ جنگل بھی تمہیں یاد ہو گا جو ہمارے باغ سے شروع ہوتا تھا۔ جب ہم پہلی مرتبہ وہاں گئے تھے تو کتنا ڈر لگا تھا۔ اب بھی میں اکثر وہاں جایا کرتی ہوں۔ وہاں سب کُچھ ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ وہی آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شاہ بلوط کے درخت ہیں۔ وہی کانٹوں بھری جھاڑیاں ہیں جن میں گلابی رنگ کے میٹھے پھل لگتے ہیں۔ وہی پیچ دار بیلیں جو کلیوں سے لد جاتی ہیں۔ وہی خُودرو جنگلی پھُول جو گھاس سے سر نکال کر جھومتے ہیں۔"

اور سب کُچھ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔

"تمہیں وہ چاندنی راتیں یاد ہیں جب ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں گھومتے تھے۔ ان دنوں میں کتنی ڈرا کرتی تھی۔ اب بھی رات کو کوئی آہٹ سنائی

دے تو سہم جاتی ہوں۔ اور کیا تمہیں وہ اون کی بلّی یاد ہے جو تم نے میری سالگرہ پر دی تھی۔ اب بھی وہ میرے پاس رکھی ہے۔ اسے ایسی جگہ رکھا ہے جہاں وہ ہر روز مجُھے نظر آتی ہے۔"

وہ بول رہی تھی۔ اس کے لب ہل رہے تھے اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں وہی فسوں تھا وہی گہرائی تھی اور وہی معصومیت۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ مجُھے سب کُچھ یاد ہے۔ ایک ایک بات یاد ہے۔ میں کُچھ بھی تو نہیں بھولا۔ مجُھے وہ بچپن یاد ہے جو ہم نے اکٹھے گزارا تھا۔ تمہاری طویل رفاقت یاد ہے۔ وہ رنگ برنگے پھُول اور ناچتی ہوئی تتلیاں بھی یاد ہیں۔ وہ جگمگاتے ہوئے لمحے بھی یاد ہیں جو ہم نے ایک دوسرے کے قریب ہو کر گزارتے تھے۔ وہ ہرا بھرا باغ، گھنا جنگل، شاہ بلوط کے دیو قامت درخت، جھلمل جھلمل کرتی ہوئی خوابیدہ جھیل، خوشنما قوسِ قزح۔ سب کے سب میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ اس نورانی چہرے والی انّا کو بھی نہیں بھولا۔ اگرچہ اسے اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گا لیکن اس کے ہاتھ کا لمس اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجُھے محبّت کی وہ تند و تیز آگ بھی یاد ہے جس میں پھنکا کرتا۔ وہ محض محبّت ہی نہیں تھی بلکہ کوئی اور جذبہ تھا۔ محبّت سے بھی معصوم اور بلند تر۔ اور مجُھے اپنی پہلی اور تلخ ترین شکست بھی یاد ہے۔

لیکن ثریّا غمگین کیوں ہے؟ سب کُچھ اس کی خواہش کے مطابق ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں لرز رہے ہیں؟ یہ بیتے ہوئے دِنوں کی باتیں کیوں کر رہی ہے؟ اپنی موجودہ زندگی کی مسرتوں کی باتیں کیوں نہیں کرتی؟ احمد کا ذکر کیوں نہیں کرتی؟

اس کی نگاہیں غمگین ہوتی گئیں۔ آنکھوں کی جھلملاہٹ بڑھتی گئی۔ اس نے اپنی پلکوں پر آئے ہوئے دو آنسو پونچھ ڈالے۔ ملگجے دوپٹے کی روپہلی گوٹ میں اس کا چہرہ کتنا پیارا الگ رہا تھا۔

اتنے میں دو بچے آ گئے۔ ایک لڑکا اور ایک بڑی بڑی آنکھوں والی نہایت خوبصورت بچّی۔

"یہ کون ہیں؟"

"پڑوس میں رہتے ہیں۔ دونوں کی بڑی گہری دوستی ہے۔ ہمیشہ اکٹھے ہوتے ہیں۔"

میں نے انہیں اپنے پاس بلا کر گود میں بٹھالیا اور پیار کرنے لگا۔ ثریّا بچّے کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ "اس کا نام تو کُچھ اور تھا لیکن میں نے اس کی امّی کو کہہ کر بدلوا

دیا۔ اب اس کا نام تمہارے نام پر رکھا ہے۔ بالکل تم سا ہے۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔"

میں نے بچّی کی آنکھوں کو دیکھا اور ایک طویل داستان میرے سامنے پھرنے لگی۔ بچپن کی معصوم رفاقت لڑکپن کی سہمی ہوئی محبّت اور پھر جوانی کی آگ۔ کیا ہمیشہ ایک ہی قصّہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کیا محبّت کے پھیکے خواب شروع شروع میں ایسے ہی رنگین ہوتے ہیں۔

احمد آ گیا۔ اور پھر ویسی ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ کافی رات گئے میں ان کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ طبیعت میں الجھن سی تھی۔ یہ محض الجھن ہی نہیں تھی، جلن تھی۔ میں دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔ سہانی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ پھُول، پتّے، ٹہنیاں سب پر روپہلی ملمع چڑھا ہوا تھا۔ چاندنی میں ہر ایک چیز کیسی عجیب لگتی ہے۔ اور یہ سائے کتنی پراسرار چیزیں ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ان میں بھی جان ہے، یہ تھرکتے بھی ہیں اور گھٹتے بڑھتے بھی رہتے ہیں۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا اور چپکے سے باغ میں چلا گیا اور سرو کے پاس بیٹھ گیا۔ اب میں چاند کو پتلی پتلی ٹہنیوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرا دِل تلملا اُٹھا، ایک سیلاب آیا اور سب کُچھ بہا کر لے گیا۔ آنکھوں کے سامنے آج سے آٹھ سال پہلے کی وہ چاندنی رات آ گئی۔

میں نے اس کا بازو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔ میں جانتا ہوں یہ سب خواب ہے تبھی تو تم اتنی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ یہ ملکوتی حسن، یہ دِل آویز تبسّم، یہ درختوں کے سائے لمبے ہو جائیں گے۔ اس جھنڈ کے پیچھے چاند چھپ جائے گا اور یہ پھُول کلیاں اور پتّے سب سو جائیں گے۔ وہ پرندہ تم نے دیکھا جو اڑا جارہا ہے۔ وہ راستہ ہے ہمارا۔ آج ہم کرنوں پر چلتے جائیں گے، حتیٰ کہ کسی ایسی طلسم زدہ جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ہم دو مُسکراتے ہوئے پھُول بن جائیں گے۔

وہ مُسکرائی اور ساری کائنات مسکرانے لگی۔ پھر میں نے اپنے خواب سنائے اور جیسے اپنی ساری زندگی اسے سونپ دی۔ لیکن اسے یہ سب کُچھ اچھا نہ لگا۔ ساری باتیں بے کار ثابت ہوئیں۔ اس کے دِل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مُجھے یاد رکھے گی۔ شاید کبھی کبھار میں اس کے خوابوں میں بھی آ جاؤں، لیکن یہ صاف صاف بتا دیا کہ ہماری راہیں مختلف ہیں۔

وہ بولی، تم ناسمجھ ہو، تمہاری طبیعت میں بچپنا ہے۔ کاش کہ تم جان سکتے کہ زندگی میں زیادہ آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جو نابود ہو جاتی ہیں۔ بیشتر خواہشیں ایسی ہیں جو دفن ہو جاتی ہیں۔ زیادہ خواب ایسے ہیں جو کُچلے جاتے ہیں اور اکثر دِل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کبھی ایک دوسرے کے رفیق نہیں بن سکتے۔ مُجھے افسوس ہے، بہت افسوس ہے کیونکہ میں

جانتی ہوں کہ تم اب مغموم رہا کرو گے اور اس بات کو دیر تک نہیں بھول سکو گے، لیکن میں مجبور ہوں۔ تم یاد آیا کرو گئے۔ مجھے تم پر کتنا ترس آ رہا ہے۔ شاید تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا۔ میرے دن کیونکر گزرتے تھے۔ مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں۔ بس سارا سارا دن تاریک گوشوں میں چھپا رہتا۔ کبھی کبھار شام کو باہر نکلتا، روشنی سے گھبراتا ہوا انسانوں سے ڈرتا ہوا۔

ایک ایک کر کے اپنے تمام دوست کھو دیئے۔ اب میرا دِل بالکل خالی تھا۔ یہاں تک کہ جو رشک یا حسد احمد کے لیے تھا وہ بھی نہ رہا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور وہ غم جو دِل پر مسلط تھا آہستہ آہستہ روح پر چھا گیا۔

ایک روز میں دُور نکل گیا اور ایک اونچے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ نیچے ایک برساتی ندی شور مچاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ میں کافی بلندی پر تھا، وہاں سے نیچے چٹانوں کی طرف دیکھا۔ نوکیلے پتھروں کو دیکھا۔

عین اس وقت مجھے ایک آواز نے چونکا دیا۔ مُڑ کر دیکھا۔ ایک دراز قد شخص پاس کھڑا تھا۔ اس کے دمکتے ہوئے چہرے پر تازگی تھی، مسکراہٹ تھی۔ اس نے

مدّ و جزر

شوخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ کُچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس نے سگریٹ پیش کی جسے میں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔

"کتنی دلفریب شام ہے۔" وہ بولا۔ "چمکتا ہوا نیلا آسمان خود رو پھُولوں کے تختے اور ہوا کے خشک جھونکے۔ اگر ایسی فضا ہر روز میسر آ جائے تو میں خُدا سے اور کُچھ نہ مانگوں۔"

میں چپ بیٹھا تھا۔

"آج اتفاق سے میں اس ندی پر مچھلی کا شکار کھیلنے چلا آیا۔ دوپہر سے گول گول پتھروں میں بیٹھا رہا ہوں۔ آپ کو اس قدر بلندی پر تنہا دیکھا تو اوپر آ گیا۔ آپ شاید غروبِ آفتاب دیکھنے اتنی بلندی پر چڑھے ہوں گے۔"

"جی نہیں ویسے ہی آ گیا تھا۔"

"آج مُجھے ایک بھی مچھلی نہیں ملی۔ البتہ چند تتلیاں میرے رنگین مفلر کو پھُولوں کا گلدستہ سمجھ کر آ گئی تھیں۔ چاہتا تو انہیں پکڑ لیتا لیکن پھر سوچا اس خوشنما دنیا میں رہنے کا جتنا حق مجھ کو ہے اتنا ہی ان رنگین تتلیوں کو بھی ہے۔ زندگی کتنی پیاری چیز ہے۔ بھلا اس رنگ و بو کے طوفان کو چھوڑ کر کون جانا پسند کرے گا؟"

"اور اگر روح رنج والم کے بوجھ سے دب جائے تو؟"

"تو یہ چمکیلا چاند ہے، یہ مُسکراتے ہوئے تارے ہیں، یہ جگمگاتے ہوئے پھُول ہیں۔ قدرت ایک مُشفق محبوب کی طرح دلداری کرتی ہے اور بہت کُچھ بھلا دیتی ہے۔"

"اور اگر آنکھیں دھندلی ہو جائیں؟"

"تو پرندوں کے سُریلے چہچہے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہوئے ہوا کے جھونکے ہیں۔"

"اگر محبّت کی ناکامی دِل میں نشتر چبھونے لگے تب؟"

"محبّت کی ناکامی کوئی ناکامی نہیں۔ محبّت جوانی کی خزاں ہے۔ محبّت روح کو گھن لگا دیتی ہے۔ بیشتر تفکّرات، رنج اور مصیبتیں محض محبّت کی وجہ سے ہیں۔ یہ ایک ایسا سودا ہے جس میں نفع کم ہے اور نقصان بہت زیادہ۔ میں آج تک کبھی غمگین نہیں ہوا۔ میں نے محبّت بھی کی ہے لیکن میری مسرتوں کی اتنی قسمیں ہیں اور میرے دِل پر خوشی کی جلا اتنی گہری ہے کہ محبّت کی اہمیت بالکل ذرا سی رہ گئی ہے۔"

"لیکن سدا کے غمزدہ دِل پر کسی خوشی کا اثر نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"یہ دنیا کتنی وسیع ہے۔ یہاں اور بھی بیشمار نعمتیں ہیں۔ کئی ایسی بھی ہیں جو محبّت کے گہرے سے گہرے زخم کو مندمل کر دیتی ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایسے لمحات آئے جب چاہتا تو رو رو کر روگ لگا لیتا اور پھر ساری عُمر نہ مُسکراتا۔ لیکن نہیں! جہاں زندگی خُدا کا تحفہ ہے، وہاں مسرور رہنا انسان کا فرض ہے۔ مُسکراتے ہوئے وقت گزارنا بھی ایک طرح کی عبادت ہے۔"

اس نے میری ناک پر رکھی ہوئی کالے شیشوں کی عینک اتار دی اور بولا۔

"یہ سیاہ عینک ہے جس سے تمہیں ہر ایک چیز تاریک نظر آ رہی ہے۔ ذرا اب دنیا کو دیکھو۔ یہ غروبِ آفتاب کتنا دلفریب ہے! یہ ماحول کس قدر روشن اور چمکیلا۔" اور واقعی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

میں بیٹھا سورج کی سنہری شعاعوں کو دیکھتا رہا۔ شفق پھولی اور سورج غروب ہو گیا۔

"اب اُدھر دیکھو۔" میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چودھویں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ چاند تیزی سے چمک رہا تھا، جیسے اس کی کرنیں سینے سے ہوتی ہوئیں دِل کو منور کرنے لگیں۔

ہم دونوں پگڈنڈی سے نیچے اتر رہے تھے۔

جب ہم جدا ہونے لگے تو وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم یہاں سے کہیں دُور چلے جاؤ۔ اس زندگی، اس ماحول اور اس پرانی فضا کو یہیں چھوڑ کر ایک نئی زندگی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ دیکھ لینا تھوڑے ہی دنوں میں تم ان غمگین لمحات پر اور اپنی اس حالت پر ہنسا کروگے۔ اور جب کبھی میں تمھیں یاد آؤں تو بس مُسکرادیا کرنا۔"

اور میں سب کُچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئی زندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سال کی آخری تاریخیں تھیں جب میں نے یہ حدود طے کیں۔ اور جب نئے سال کا پہلا سورج طلوع ہوا تو میں نئے خِطّوں میں تھا۔

لیکن یہ سب کُچھ بھولنے میں کُچھ دیر لگی۔ پھر میں ایک بالکل نئی دنیا میں تھا۔ نئی زندگی تھی۔ سب کُچھ نیا تھا۔

اور اب۔ کیا میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ کل تھا۔ کیا واقعی میں مسرور اور مطمئن ہوں؟ کیا واقعی اپنے ماضی کو دفن کر چکا ہوں؟

کہیں اتنے سال اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دیتا رہا؟

میں اب تک مسرت کی تلاش میں رہا ہوں۔ میں نے لق و دق صحراؤں میں تاریک اور سنسان جنگلوں میں مسرت کو ڈھونڈا۔ ویرانوں میں، اُجاڑ کھنڈروں

میں، آباد محفلوں میں، اسے ڈھونڈا۔ میں نے غمزدہ روحوں کی صحبت میں، بے کس ہستیوں کی دلجوئی میں، مُسکراتی ہوئی مخلوق کے قرب میں، دمکتے ہوئے چہروں میں، آسمانی نغموں میں اس کی تلاش کی۔

اور جب میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا تو سرو کے درختوں میں ثریّا ملی جو بے حد غمگین نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ایک آنسو پونچھا جو میرے رخسار پر پھسل رہا تھا۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب سے گزرے تو میں نے صبح بخیر کہا اور اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

کُچھ دیر کے بعد میں ٹرین میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج نئے سال کی پہلی صبح ہے۔ آج لوگوں کے دِل میں کیسی کیسی امنگیں ہوں گی۔ لوگ مسرتوں کے لیے دُعا مانگ رہے ہوں گے۔ اور ایک میں ہوں جس کے لیے یہ چمکیلا دن ایک اداس کی شام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور اب میں کہاں جارہا ہوں؟ مُجھے کہاں جانا چاہیے؟ میری منزل کہاں ہے؟

کیا لوٹ کر پھر یہاں سے بہت دُور چلا جاؤں؟ اس مرتبہ اتنی دُور کہ پھر کبھی واپس نہ آسکوں؟

میں نے ملّاحوں سے سُنا تھا کہ انہیں سمندر کی تنہائی اور رات کی ظلمتوں میں پراسرار آوازیں سنائی دیا کرتی ہیں۔ تاریکیوں سے کوئی ان کا نام لے لے کر پکارتا ہے۔

کئی سیّاحوں نے بتایا تھا کہ گھنے جنگلوں اور ویران صحراؤں میں رات کو سفر کرتے وقت کتنی ہی مرتبہ انہوں نے کسی نامعلوم ہستی کو ان کا نام پکارتے سنا تھا۔

اب میں زندگی کے ان کھنڈروں اور ویرانوں میں سے کسی کو اپنا نام پکارتے ہوئے صاف سن رہا تھا۔

تنہائی مُجھے پکارتی رہی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سنہری دھوپ، لہلہاتا ہوا سبزہ، پیلے پیلے کھیت، درختوں کی قطاریں، پھوار اڑاتی ہوئی ندیاں اور اوپر نیلا نیلا چمکتا ہوا آسمان۔ ابھی دو دن بھی نہیں گزرے میں کس قدر مختلف تھا۔ طرح طرح کی امنگیں تھیں، زندگی کی تمام خوشیاں مجھ پر مُسکراتی تھیں۔ چٹان کی طرح مضبوط دِل تھا۔ اور اب اتنی سی دیر میں اس بچّے کی طرح آزردہ ہوں جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔

ایک لہر آتی ہے۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں جا سکتی ہے۔ دوسری کنارے پر چھوڑ جاتی ہے۔ تیسری کنارے سے بہا کر پھر سمندر میں لے جاتی ہے۔

کتنا عجیب ہے زندگی کا مدّ و جزر!

ختم شد